

تاریخ تدوین حدیث

مولانا عبدالرشید عثمانی



سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات، رائے بریلی

تاریخ تدوین حدیث

از حضرت مولانا عبد الرشید نعمانی ^{رح}

سید احمد شہید اکیڈمی، دار عرفات، رائے بریلی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب :	تاریخ تدوین حدیث
صفحات :	۲۴۲ از حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی
سن اشاعت :	۲۰۰۲ء
کمپوزنگ :	خورشید اختر ندوی رائے بریلی
طباعت :	پارکھ آفسیٹ پرنٹنگ پریس Ph. 789966, 338583

سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات، تملیہ کلاں، رائے بریلی

نمبر شمار	فہرست	صفحہ
۱	عرضِ ناشر	۷
۲	مصنفِ کتاب (ایک تعارف)	۹
۳	حدیث کیا ہے؟	۲۵
۴	حدیث کی دینی حیثیت	۲۷
۵	آپ ﷺ مبلغ تھے	۲۷
۶	آپ ﷺ مراد الہی کے مبین یعنی بیان کرنے والے ہیں	۲۷
۷	آپ ﷺ معلمِ کتاب و حکمت ہیں	۲۸
۸	تحلیل و تحریم یعنی اشیاء کو حلال و حرام کرنا	۲۸
۹	آپ ﷺ امت کے تمام معاملات اور فیصلوں میں قاضی ہیں	۲۹
۱۰	آپ ﷺ امت کے تمام جھگڑوں اور قضیوں میں حکم ہیں	۲۹
۱۱	آپ ﷺ کی ذات قدسی صفات میں ہر مومن کے لئے اسوۂ حسنہ ہے	۳۰
۱۲	آپ ﷺ کی اتباع سب پر فرض ہے	۳۰
۱۳	جو کچھ آپ ﷺ دیں اس کو لینا اور جس چیز سے منع فرمائیں اس سے باز رہنا ضروری ہے	۳۱
۱۴	آپ ﷺ کی اطاعت تمام مسلمانوں پر فرض ہے	۳۱
۱۵	ہدایت آپ ﷺ کی اطاعت سے وابستہ ہے	۳۱
۱۶	کتابتِ حدیث	۳۲

۳۶	احادیثِ فعلیہ	۱۷
۴۰	آنحضرت ﷺ کی طرف سے املا	۱۸
۴۸	عہدِ رسالت میں صحابہ کے بعض نوشتے	۱۹
۵۵	صحابہ کرامؓ کے بعض اور نوشتے	۲۰
۵۹	عہدِ صحابہ میں تابعین کے نوشتے	۲۱
۶۱	حفظِ حدیث	۲۲
۶۵	حفاظِ حدیث کے تذکرے	۲۳
۷۳	تدوینِ حدیث	۲۳
۸۵	دوسری صدی ہجری کی تصنیفات	۲۵
۸۶	کتاب الآثار	۲۶
۱۰۹	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۲۷
۱۱۳	کتاب الآثار کے نسخے	۲۸
۱۱۳	امام زفر بن الہذیلؒ	۲۹
۱۱۵	امام ابو یوسفؒ	۳۰
۱۱۶	امام محمد بن حسن شیبائیؒ	۳۱
۱۱۷	امام حسن بن زید دلوویؒ	۳۲
۱۲۱	موطا	۳۳
۱۳۴	موطا کا زمانہ تالیف	۳۴
۱۳۶	جامع سفیان ثوری	۳۵

۱۳۲	اس دور کے بعض اور مصنفین	۳۶
۱۳۴	فہرست جرح و تعدیل کی ابتداء	۳۷
۱۳۷	اس دور میں علماء کا طرز عمل	۳۸
۱۵۶	امام ابو حنیفہؒ و امام مالکؒ کے تلامذہ اور علم حدیث	۳۹
۱۶۵	علم حدیث تیسری صدی میں	۴۰
۱۸۵	مسند اسحاق بن راہویہ	۴۱
۱۸۶	مسند امام احمد	۴۲
۱۹۲	صحاح ستہ کی تدوین	۴۳
۱۹۳	صحیح بخاری	۴۴
۱۹۹	صحیح مسلم	۴۵
۲۰۴	سنن نسائی	۴۶
۲۱۰	سنن ابی داؤد	۴۷
۲۲۲	جامع ترمذی	۴۸
۲۳۲	سنن ابن ماجہ	۴۹

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عرض ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی کے بنیادی مقاصد میں ان کتابوں کی بھی اشاعت ہے جو اسلامی علوم و فنون سے متعلق کسی موضوع پر لکھی گئی ہوں، جن میں محققین علماء اور صاحب ذوق متہی طلباء کے لئے خاطر خواہ مواد موجود ہو اور وہ اس کی روشنی میں تحقیق و نظر کا سفر جاری رکھ سکیں۔

پیش نظر کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، جس میں تدوین حدیث کی تاریخ کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے اندر حدیث کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے، اور بہت سے وہ حقائق سامنے آ جاتے ہیں جن کی طرف عام طور پر مطالعہ کرنے والوں کی نگاہ نہیں پہنچتی۔

مصنف کتاب حضرت مولانا عبدالرشید نعمانیؒ صاحب نظر محدث اور صاحب ذوق عالم و محقق تھے، اردو میں ان کی سب سے زیادہ معروف کتاب ”ابن ماجہ اور علم حدیث“ ہے، جو پاکستان سے کئی مرتبہ شائع ہو کر داد و تحیق حاصل کر چکی ہے، کہنے کو یہ امام ابن ماجہ کی سوانح عمری ہے لیکن حقیقت میں مسلمانوں کی ان

جانشانیوں اور قربانیوں کا حسین مرقع ہے جو انہوں نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کو محفوظ کرنے کے لئے پیش کی ہیں، اور اس طرح اس میں تدوین حدیث کی پوری تاریخ قلمبند ہو گئی ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ کتاب کا نام اس کتاب کے لئے ایک جاب بن گیا ہے۔

زمانہ سے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ کتاب میں تدوین حدیث سے متعلق مواد کو (جو خاصے کی چیز ہے) علیحدہ شائع کیا جائے تاکہ اس سے عمومی فائدہ اٹھایا جاسکے، اس عاجز کو مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہے اور مولانا کی محبت و شفقت کا حظ اس نے اٹھایا ہے، یہ اس کے لئے سعادت کی بات ہے کہ اپنے محبوب و محسن استاد کی تصنیف ہندوستان میں شائع کرنے کا شرف اس کو حاصل ہو رہا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو مولانا کے لئے صدقہ جاریہ بنائے، اور ناکارہ کے لئے مغفرت و نجات کا ذریعہ فرمائے، اور جن دوستوں نے اس کی اشاعت میں مدد کی ان سب کو اجر عطا فرمائے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ

بلال عبدالحی حسنی ندوی

چهار شنبہ ۳ صفر ۱۴۲۳ھ

مصنف کتاب

(ایک تعارف)

محدث جلیل حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان بلند پایہ صاحب نظر محدثین میں ہوتا ہے جو ملت اسلامیہ کے لئے باعث فخر تھے، علم کی چنگلی اور گہرائی کے ساتھ زہد و تقویٰ میں نمایاں امتیاز ان کی وہ صفت تھی جس نے ان کو نمونہ سلف بنادیا تھا، طبقات کتب اور طبقات رجال پر ان کی دور رس نگاہ نے ان کو اپنا نئے زمانہ میں ایک نمایاں مقام عطا کیا تھا، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ انہوں نے امت کو بڑا فائدہ پہنچایا، ان کی صحبت میں بڑی تاثیر تھی، ان کے درس میں شریک ہونے والوں اور ان کی مجلس کے حاضر باشوں نے اس باب میں بھی ان سے فیض اٹھایا، نصف صدی سے زائد ان کے فیوض علمی و روحانی کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا کا آبائی وطن جے پور ہے، ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۴ھ کو غالباً اکتوبر کے مہینہ میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم متوسطات تک اپنے وطن ہی میں حاصل کی،

تکمیل کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا انتخاب کیا جہاں مولانا ہی کے ہم وطن حضرت مولانا حیدر حسن خاں منصب اہتمام پر فائز تھے اور حدیث کی منتہی کتابوں کا درس بھی ان ہی سے متعلق تھا۔

مولانا مرحوم مسلسل چار سال دارالعلوم میں تکمیل کے لئے مقیم رہے، عربی ادب کے کئی اساتذہ سے استفادہ کیا، مگر مولانا کی توجہ کا اصل محور مولانا حیدر حسن خاں صاحب کی ذات گرامی تھی جو اس وقت دارالعلوم کے شیخ الحدیث اور امام المحدثین علامہ حسین بن محسن انصاری یمنی کے خاص تلامذہ و مستفیدین میں تھے۔

مولانا نعمانی نے مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے بھرپور استفادہ کیا اور شب و روز حاضر باش رہے، انہوں نے مولانا کو خلوت و جلوت، مشغولیت و راحت اور رات و دن کے مختلف حصوں میں بے تکلف دیکھا، مولانا کی صفات و کمالات اور پھر زاہدانہ زندگی کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے تھی جس کو انہوں نے اپنی زندگی میں اس طرح جذب کر لیا کہ گویا وہ مولانا کے مثنیٰ بن گئے، یہیں سے ان کے اندر حدیث کا وہ ذوق پیدا ہوا جس نے ان کو متقدمین محدثین کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا اور یہیں ان کو زہد کا وہ ذائقہ ملا جو اسلاف کی میراث ہے۔

مولانا کے اسی شوق و طلب کو دیکھتے ہوئے (جس میں ہم وطنی کا ایک رشتہ بھی شامل ہو گیا تھا) مولانا حیدر حسن خاں صاحب نے خصوصی شفقت و توجہ فرمائی اور تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی پورا خیال رکھا جس نے مولانا نعمانی کے ذاتی جوہر کو جلا بخشی، اختصاص فی الحدیث اور تعق فی العلم کے ساتھ ان کی عملی زندگی میں بھی ایک امتیازی شان پیدا ہو گئی، مولانا حیدر حسن خاں صاحب خود حضرت حاجی

امداد اللہ صاحب کے اجازت یافتہ اور صاحب سلسلہ تھے، ان کی جو ہر شاس نگاہ نے مولانا کے اس امتیازی وصف کو بھانپ لیا اور سند فضیلت کے ساتھ ہی اجازت بیعت و ارشاد سے بھی سرفراز فرمایا۔

ندوہ میں تکمیل کے بعد ایک عرصہ تک مولانا اپنے وطن ہی میں مقیم رہے اور اس دوران بھی مولانا حیدر خاں صاحب سے استفادہ کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد ندوۃ المصنفین کے ذمہ داروں کی خواہش پر دہلی تشریف لے گئے اور اس ادارہ سے باقاعدہ وابستہ ہوئے، اسی زمانہ میں امام حاکم نیشاپوری کی اصول حدیث پر مشہور کتاب ”المدخل“ پر ایک طویل تبصرہ اردو میں تحریر فرمایا جو شاید مولانا کا باقاعدہ پہلا مضمون تھا جو ان کے ذوق تحقیق و نظر کا شاہکار ہے، یہ تبصرہ ”المدخل“ کے ساتھ ہی طبع ہوا، ایک مرتبہ علامہ شبیر احمد عثمانی کسی تقریب سے ندوۃ المصنفین تشریف لائے، یہ تبصرہ مولانا عثمانی کی نظر سے گذر چکا تھا، جب مولانا کا تعارف کرایا گیا تو مولانا عثمانی نے مسرت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ ”اچھا آپ ہی صاحب المدخل ہیں“ اور دادِ تحقیق دی، وہیں قیام کے دوران ذمہ داروں کی خواہش پر ”لغات القرآن“ چار جلدوں میں مرتب فرمائی، لیکن اس کی تکمیل نہ ہو سکی اور بعض اسباب کی بنا پر پاکستان ہجرت فرمائی، بعد میں مولانا عبدالدائم جلالی صاحب نے مزید دو جلدوں میں اس کی تکمیل فرمائی اور کتاب ندوۃ المصنفین سے ہی شائع کی گئی، مولانا ندوۃ المصنفین کے رفیق بھی تھے، اور ”مجلس احیاء المعارف النعمانیة“ حیدر آباد دکن کے رکن رکین بھی، مولانا ابوالوفاء افغانی سے ہم مسلک و ہم مشرب ہونے کی بنا پر بڑی مناسبت تھی، پاکستان جانے کے بعد دارالعلوم اشرف آباد

ٹنڈوالا یار سے وابستہ ہو کر تدریسی خدمات انجام دیں، پھر ایک عرصہ تک جامعہ اسلامیہ بھاولپور کے شعبہ اسلامیات کے صدر رہے، اخیر میں مولانا یوسف بنوریؒ کے قائم کردہ ادارہ جامعہ العلوم الاسلامیہ مولانا ہی کی خواہش پر تشریف لے آئے، اور معذوری کے اخیر چند سالوں کو مستثنیٰ کر کے کہا جاسکتا ہے بقیہ زندگی وہیں درس و تدریس اور تصنیف و تحقیق میں گذاری،

مولانا کا چونکہ اصل ذوق تصنیف و تالیف کا تھا اس لئے اسفار سے مناسبت کم تھی تاہم حج کے لئے متعدد مرتبہ تشریف لے گئے۔ ترکی کے سفر کی مولانا کو بڑی تمنا تھی، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں قدیم اسلامی مخطوطات کا جو ذخیرہ کتب خانوں میں موجود ہے شاید وہ کسی دوسرے ملک میں نہ ہو، ان میں بڑی تعداد علمائے احناف کی تصنیفات کی ہے، یہ مولانا کے سفر کا بڑا محرک تھا، اللہ تعالیٰ نے مولانا کی یہ خواہش پوری فرمادی اور مولانا اپنے صاحبزادہ مولانا عبدالشہید صاحب نعمانی کے ہمراہ تشریف لے گئے اور مختصر مدت قیام فرما کر مراجعت فرمائی، اپنے ساتھ متعدد مخطوطات کے عکس بھی لائے۔

سفر ہجرت کے بعد تین مرتبہ مولانا ہندوستان تشریف لائے، پہلی تشریف آوری ۱۳۰۲ھ میں ہوئی، اور مولانا نے پورا رمضان دائرہ شاہ علم اللہ میں گزارا، اس مدت قیام میں دارالعلوم کے بعض اساتذہ اور درجات عالیہ کے طلبہ مستفید ہوتے رہے، اصول حدیث کی مشہور کتاب ”علوم الحدیث“ (جو علامہ ابن الصلاح کی تصنیف کردہ اور مقدمہ ابن صلاح کے نام سے مشہور ہے) زیر درس رہی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش پر متعدد مرتبہ مسجد

میں وعظ بھی فرمایا، مولانا کا وعظ ایسا دلنشین اور موثر ہوتا تھا، کہ ”از دل خیزد بردل ریزد“ کا مصداق ہوتا، مولانا کے سفر کا اصل مقصد حضرت مولانا سے اصلاح و ارشاد کا تعلق قائم کرنا تھا، یہ مولانا کی سادگی، بے نفسی اور اصلاح حال کی انتہائی فکر کا نتیجہ تھا، ورنہ مولانا خود صاحب نسبت اور صاحب مقام بزرگ تھے، حضرت نے اس تعلق کے کچھ ہی عرصہ بعد اجازت بیعت مرحمت فرمائی اور پاکستان میں بیعت ہونے والے متعدد حضرات کو مولانا کے سپرد کیا۔

حضرت والا مولانا کے فضل و کمال کے بڑے معترف و قدرداں تھے، حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کے تذکرہ کے ذیل میں مولانا کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں

”لیکن مولانا کے تلمیذ ارشد اور ان کے فن و ذوق کے وارث ہمارے فاضل دوست مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی جے پوری، حال شیخ الحدیث دینیات یونیورسٹی بھاوپور ہیں، ان کے علمی کام تعارف کے محتاج نہیں، ان میں لغات القرآن کی تین جلدیں اور ان کا اصل علمی و تحقیقی کام ”ما تمس إلیہ الحاجة“ جو ان کی وسعت مطالعہ اور دقت نظر کی شاہد ہے، خاص امتیاز رکھتا ہے انھوں نے کئی سال سفر و حضر میں مولانا کے ساتھ رہ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی اور ٹونک کے زمانہ قیام میں بھی کسب فیض کیا اور مولانا کی تحقیقات سے پورا فائدہ اٹھایا، مولانا کو بھی ان سے بڑا گہرا تعلق اور ان پر بڑا اعتماد تھا“

۱۴۰۹ھ میں دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولانا ضیاء الحسن صاحب کی اچانک وفات سے بڑا خلا پیدا ہوا اور بڑی شدت سے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اس موقع سے مولانا کچھ عرصہ کے لئے تشریف لے آئیں تو طلبہ کو استفادہ کا موقع ملے اور یہ خلا بھی پُر ہو سکے، مولانا سے جب اس کی خواہش کا اظہار کیا گیا تو معذرت نہ فرما سکے اور تشریف آوری ہو گئی، کچھ عرصہ کے لئے باقاعدہ، بخاری شریف مولانا کے ذمہ کر دی گئی یہ آخری سال کا وہ درجہ تھا جس میں شرکت کی سعادت راقم کو بھی حاصل تھی، اس طرح باقاعدہ مولانا سے براہ راست استفادہ کا شرف حاصل ہوا، مولانا کے طرزِ تدریس پر کچھ لکھنے کے بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے طرزِ تدریس پر حضرت مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کو نقل کر دیا جائے کہ وہ مولانا کے طریقہ تدریس پر بھی حرف بہ حرف صادق آتا ہے معمولی حذف و اضافہ کے ساتھ یہاں اس کو پیش کیا جا رہا ہے۔

”مولانا کا درس عملی تھا اور طلباء اس میں صرف سامع یا مجلس و عظ کے حاضرین کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، فن حدیث کی بنیادی کتابیں ساتھ ہوتیں اور طلباء کو حکم ہوتا فلاں جگہ سے کھولو اور پڑھو، بعض مرتبہ کئی کئی کتابیں ایک ساتھ کھل جاتیں اور ان پر آزادانہ بحث ہوتی طلبہ آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اس بحث و مذاکرہ میں حصہ لیتے، مولانا کو وہی طالب علم زیادہ عزیز تھا جو آزادی سے بحث کرے اور مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرے اس لئے بعض اوقات متصلب حنفی ہونے کے باوجود ان اہل حدیث طلباء پر زیادہ شفقت و التفات ہوتا جو تیار

کر کے آتے اور بات سمجھنے کی کوشش کرتے، تدریس حدیث کا طرز
محدثانہ تھا، یعنی علماء کی کتابوں سے استفادہ بھی پورا تھا، خاص طور پر
الامیر محمد بن اسماعیل صنعانی، شیخ محمد بن ابراہیم بن انور، علامہ مقبلی
اور علامہ شوکانی کی کتابیں مطالعہ میں رہتیں اور ان کا حوالہ دیتے، علمائے
احناف میں سے بھی ان کتابوں کا حوالہ زیادہ دیتے جن کا پایہ حدیث
میں مسلم ہے مثلاً متقدمین میں امام طحاوی اور متوسطین و متاخرین میں
علامہ زیلعی، ابن کمال، قاسم بن قطلوبغا اور علامہ ابن ہمام، مولانا کے
درس کی ایک برکت یہ تھی کہ فن حدیث سے مناسبت اور ان کی بنیادی
کتابوں سے ذاتی واقفیت، ان کے درجات اور طبقات سے پوری
آگاہی اور اسماء الرجال اور اصول حدیث کی کتابوں سے فائدہ اٹھانے
کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی۔“ (۱)

مولانا کے اس طویل قیام سے طلبہ کو بڑا علمی و دینی فائدہ پہونچا، مولانا
کے درس میں بھی برکت تھی اور صحبت میں بھی تاثیر، اس طرح طلبہ میں حدیث کا ذوق
بھی پیدا ہوا، اور اصلاح نفس کا خیال بھی، درس میں دارالعلوم کے بعض اساتذہ بھی
شریک ہوتے، مولانا ان کا احترام ملحوظ رکھتے، مولانا تین مہینہ قیام کے بعد تشریف
لے گئے، لیکن اپنی یادوں کے نقوش ثبت کر گئے متعدد اساتذہ اور طلبہ نے مراسلت
کے ذریعہ سے استفادہ جاری رکھا۔

۱۴۱۲ھ میں تیسری بار مولانا ہندوستان تشریف لائے چند روزہ قیام میں

بھوپال بھی تشریف لے گئے اور رابطہ ادب اسلامی کے ایک جلسہ کی صدارت بھی فرمائی، دوران سفر افادات کا سلسلہ جاری رہا، دارالعلوم میں قیام کے دوران شرح منجہ کا درس بھی ہوتا رہا جو بڑا عالمانہ اور محققانہ ہوتا تھا، یہ مولانا کا آخری سفر ثابت ہوا اور بالآخر سفر آخرت پیش آگیا۔

مولانا بسیار نوپس نہیں تھے لیکن جو لکھتے پوری تحقیق و امانت کے ساتھ لکھتے تھے، زبان بھی صاف اور شستہ ہوتی، عربی اردو پر تقریباً یکساں قدرت تھی، ذوق تحقیق اور دقت نظر میں اپنے معاصرین سے فائق تھے، علمی نکات پر گرفت بڑی مضبوط تھی، مولانا کی تصنیفات مولانا کے امتیاز کا منہ بولا ثبوت ہیں۔

مولانا کے قلم سے جو سب سے پہلا مضمون نکلا وہ امام حاکم نیشاپوریؒ کے مشہور رسالہ ”المدخل فی أصول الحدیث“ پر ایک علمی و تحقیقی تبصرہ تھا، جس میں اس کے مباحث پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے، یہ تبصرہ ندوۃ المصنفین سے شائع ہونے والا موقر ماہنامہ ”برہان“ میں چھ قسطوں میں شائع ہوا اور علماء نے اس کو تحسین کی نظر سے دیکھا، اس وقت مولانا کی عمر صرف پچیس سال تھی۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی رائے اس کے بارے میں گزر چکی ہے، مشہور عالم و مصنف حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے اس مقالہ کا مطالعہ کرنے کے بعد مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو جو مکتوب تحریر فرمایا اس کی حسب ذیل عبارت خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے جس سے مقالہ کی علمی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

”بھی یہ مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی تو بڑے چھپے رستم نکلے،

اللہ تعالیٰ ان کے علم و افاضہ میں برکت دے، اس قسم کے علمی

و تحقیقی مضامین کو دیکھ کر گو نہ اطمینان ہوتا ہے کہ بزرگوں کے جانے کے بعد ان کی خصوصیات کے وارث انشاء اللہ رہیں گے، اس لئے اس قسم کے مضامین سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔“

یہ مقالہ مولانا کے برادر عزیز ڈاکٹر عبدالرحمن غنفر صاحب نے المدخل کے عربی متن کے ساتھ کتابی شکل میں افادہ عام کی غرض سے کراچی سے شائع کر دیا ہے۔ مولانا کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ”ما تمس إلیہ الحاجة لمن یطالع سنن ابن ماجہ“ ہے، جو مولانا کی دقت نظر اور وسعت مطالعہ کی دلیل ہے، اور مولانا کے علمی و تحقیقی کاموں میں ایک امتیاز رکھتی ہے، یہ کتاب بھی مولانا نے اپنے زمانہ شباب ہی میں تصنیف فرمائی ہے، اس کو علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس وقت کے کبار محدثین و علماء نے اس سے استفادہ کیا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ نے بھی اپنی بعض تصانیف میں اس کتاب کے حوالے دیئے ہیں، حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی صاحبؒ نے ”أمانی الأحبار فی شرح معانی الآثار“ میں اس سے استفادہ کیا ہے، ابھی چند سال قبل محدث جلیل علامہ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے اپنی تحقیق و مراجعت کے ساتھ بڑے اہتمام سے یہ کتاب شائع کی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دمشق کے بعض مدارس و کلیات میں یہ کتاب داخل نصاب کی گئی۔

اسی کتاب کے اردو ترجمہ کا جب مولانا مرحوم سے تقاضہ کیا گیا تو مولانا نے اس کتاب کو سامنے رکھ کر بڑے مفید اور قیمتی اضافوں کے ساتھ اس کو مرتب فرمایا جو ”ابن ماجہ اور علم حدیث“ کے نام سے شائع ہوا، اس کتاب کے بارے میں خود مولانا

کے الفاظ یہ ہیں ”کہنے کو یہ ابن ماجہ کی ایک سوانح عمری ہے لیکن درحقیقت یہ تدوین حدیث کی مفصل تاریخ ہے اور مسلمانوں کی ان جانفشانیوں کا مرقع ہے جو انہوں نے خدا کے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کے ایک ایک حرف کو محفوظ کرنے کے لئے اٹھائی ہیں، تاکہ امانت وحی کی ذمہ داری میں جو اس امت کے سپرد کی گئی تھی کسی قسم کا رخنہ نہ آنے پائے اور اللہ تعالیٰ کی حجت اہل ملل وادیان پر تمام ہو جائے۔“

واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ”دریا بکوزہ“ کا مصداق ہے اور علم کا ایک سمندر ہے، اس میں علم حدیث کا تعارف بھی ہے، اس کی تدوین کی تاریخ بھی، صحاح ستہ پر جچا تلا تبصرہ بھی ہے اور طبقات کتب کی تعیین بھی، اور حقیقت یہ ہے کہ کتاب کے نام سے اصل کتاب کے مضامین اور مندرجات پر ایک پردہ سا پڑ گیا ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری صاحب معارف السنن کا معمول تھا کہ ابتدائے سال میں درس شروع کرتے وقت پہلے اس کتاب کا ایک حصہ خود سناتے یا کسی طالب علم سے پڑھواتے اس کے بعد درس کی ابتداء فرماتے، اس کتاب کے متعدد ایڈیشن پاکستان سے شائع ہوئے اور علمی و مدرسی حلقوں میں مقبول ہوئے۔ سندھی ادبی بورڈ کراچی (حال حیدر آباد) نے متعدد سندھی علماء کی تصانیف مولانا کی تصحیح و تحقیق، مبسوط مقدمہ و تعارف اور قیمتی تعلیقات و حواشی کے ساتھ شائع کی ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ”دراسات اللیب فی الأسوة الحسنة بالحبیب“ یہ مخدوم مولانا محمد معین سندھی کی تصنیف ہے، جس میں انہوں نے اہل سنت والجماعت کے عقیدہ و مسلک سے ہٹ کر بعض نظریات پیش کئے ہیں، مولانا نے ان کا تعاقب کیا ہے، اور

مولانا کے ان ہی تعقبات کے ساتھ یہ کتاب شائع ہوئی، مولانا سید احمد رضا بجنوری نے ”انوار الباری“ کے مقدمہ میں ان حواشی و تعلیقات کو ”التعقبات علی الدراسات“ کے نام سے مولانا کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔

(۲) ”ذبت ذباب الدراسات عن المذهب الأربعة المتناسبات“

یہ مخدوم مولانا عبداللطیف سندھی کی تصنیف ہے جو دراسات الملیب کے رد میں لکھی گئی ہے، اور مولانا کے قیمتی حواشی اور مقدمہ کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۳) ”مقدمة كتاب التعليم“ یہ علامہ مسعود بن شیبہ سندھی کی

تصنیف ہے جس پر مولانا کا مبسوط مقدمہ اور علمی حواشی ہیں، یہ کتاب بھی سندھی بورڈ سے شائع ہوئی ہے۔

مولانا اپنے استاذ و شیخ حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب کی طرح امام ابوحنیفہؒ کی محبت و عقیدت سے سرشار تھے، کبھی کبھی تذکرہ کرتے ہوئے رقت طاری ہو جاتی، مولانا کی تصانیف میں بھی یہ رنگ نمایاں تھا، مگر یہ حمایت بلکہ حمیت پوری امانت و دیانت کے ساتھ تھی، احتاف کی طرف سے مولانا نے بہت کچھ دفاع بھی کیا اور بڑی خدمت کی، مولانا ہی کی فکر و مساعی سے امام صاحب کی بعض مسانید شائع ہوئیں اور ائمہ احتاف کی بعض شائع شدہ مشہور کتابیں مولانا کے مبسوط اور محققانہ مقدموں کے ساتھ منظر عام پر آئیں، یہ مقدمات خود اپنی جگہ بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہیں، ان میں موطا امام محمد، کتاب الآثار، اور جامع المسانید سر فہرست ہیں، ان کے مقدمات میں مولانا نے ان کتابوں کی اہمیت، احادیث کی صحت اور ان کے مختلف نسخوں کی نشاندہی فرمائی ہے، کتاب الآثار پر مولانا کی بعض تعلیقات بھی ہیں۔

آخر میں ”مکانة أبي حنيفة في علم الحديث“ کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی، جس میں فن حدیث میں امام صاحب کے مرتبہ سے بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں ائمہ فن کے اعتراضات کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس سے پہلے بھی امام صاحب کے فضائل و مناقب پر ائمہ نے قلم اٹھایا، جن میں امام ابن عبد البر مالکی، امام ذہبی، امام سیوطی اور امام ابن حجر مکی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، یہ بھی ملحوظ رہے کہ مؤخر الذکر تینوں شافعی عالم ہیں، مولانا کی یہ کتاب اختصاص فی الفن اور جامعیت کے لحاظ سے فائق ہے، علامہ عبدالفتاح ابو غدہ نے یہ کتاب بھی اپنی تحقیق و مقدمہ کے ساتھ شائع کی ہے، اور مقدمہ میں مولانا کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے۔

طبقات کتب اور طبقات رجال پر مولانا کی جو نظر تھی شاید ہی کوئی دوسرا معاصر اس میں ان کا شریک ہو، اس کے ساتھ اصول پر بھی اچھی نگاہ تھی، حافظ ابن حجر کی مشہور و مقبول کتاب شرح نخبہ کا درس بڑا محققانہ ہوتا، کراچی سے مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونگی کے حواشی کے ساتھ جو شرح نخبہ شائع ہوئی اس پر مولانا کی بھی بعض مفید اور اہم تعلیقات ہیں۔

جس طرح ایک طرف عالم اسلام کے مکتف حصوں میں رفض و شیعیت کا زور ہوا اور علماء حق نے اس کی سرکوبی کے لئے کوششیں کیں، اسی طرح بعض علاقوں میں نواصب نے سر اٹھایا، خاص طور پر پاکستان کے بعض علاقے اس کی زد میں آئے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ردِ ناصبیہ پر بھی اہل حق کی طرف سے قلم اٹھایا جائے۔

مولانا اگرچہ خالص حدیث کا ذوق رکھنے والے ایک تبحر عالم تھے مگر اسی

احساس کے پیش نظر مولانا نے اس موضوع پر بھی متعدد رسالے تصنیف کئے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) یزید کی شخصیت اہل سنت کی نظر میں (۲) شہداء کربلا پر افتراء (۳) اکابر صحابہ پر بہتان (۴) ناصیۃ تحقیق کے بھیس میں۔

اخیر میں ”حضرت علیؓ اور قصاص حضرت عثمانؓ“ کے موضوع پر ایک مفصل مضمون سپر و قلم فرمایا جو کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

یہ جملے کہتے ہوئے بعض مرتبہ مولانا کی آواز بھڑا گئی اور آنکھیں نم ہو گئیں کہ ”میں نے حضرت حسینؓ اور امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے بہت کچھ دفاع کیا، ان حضرات سے مجھے امید ہے کہ بروز قیامت یہ میری سفارش کریں گے“

مولانا کے ان فضائل و کمالات اور خاص طور سے فن حدیث پر عبور اور اس میں گہرائی کا نتیجہ تھا کہ معاصر علماء نے کھل کر اعتراف کیا اور دانشمین دی، اس کا جا بجا ذکر مضمون میں آچکا ہے، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، صاحب ”ترجمان السنۃ“ نے مولانا کے بارے میں لکھا ہے:

”مولانا محمد عبدالرشید صاحب تاریخ و حدیث و رجال اور بعض

دیگر فنون حدیث میں غیر معمولی قابلیت کے مالک ہیں اور اس

موضوع کی کتب مخطوطہ و مطبوعہ پر عالمانہ نگاہ رکھتے ہیں، محنتی

سادہ مزاج اور مستعد عالم ہیں۔“

مولانا سید احمد رضا بجنوری (خویش و تلمیذ علامہ انور شاہ کشمیری) مقدمہ

انوار الباری شرح صحیح البخاری میں تذکرہ محدثین کے عنوان سے مولانا کے بارے میں تحریر کرتے ہیں، ”علامہ محدث، ادیب، فاضل، مولانا محمد عبدالرشید نعمانی مشہور مصنف، محقق محدث، جامع معقول منقول ہیں، آپ نے نہایت مفید علمی تصانیف فرمائی ہیں اور آپ کی تمام کتابیں گہری ریسرچ کا نتیجہ اور اعلیٰ تحقیق کی حامل ہیں۔“

محدث کبیر علامہ عبدالفتاح البوندہ نے مولانا کی کتاب ”مکانة أبي حنيفة في الحديث“ کے مقدمہ میں مولانا کی صفات، علمی ذہن، دقت نظر اور محنت شاقہ کا اعتراف کیا ہے۔

مولانا ان علمی فضائل و کمالات کے ساتھ عملی زندگی میں بھی ایک امتیاز رکھتے تھے، سادگی و تواضع، بلند اخلاقی، صبر و رضا، زہد و قناعت جیسی صفات سے آراستہ اور سلف کا نمونہ تھے، خود نمائی سے بڑی نفرت تھی، مجالس میں صدر نشین ہونا پسند نہ تھا، سنتوں کا خود بھی اہتمام کرتے اور دوسروں کو بھی تاکید فرماتے، رسمیات سے بڑا توحش تھا، یہاں تک کہ اپنی بعض کتابوں کے رسم اجراء کی خبر ملی تو پسند نہ ہوا، مزاج میں علم کی متانت کے ساتھ ظرافت بھی تھی، جس کا بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ طلبہ کی جھجک ختم ہو جاتی، حجاب دور ہو جاتا اور استفادہ آسان ہوتا۔

آخری سفر ہندوستان میں جب کانپور تشریف لے گئے تو شہر کی ایک چھوٹی سی مسجد کے حجرے میں قیام پسند فرمایا، جو اتنا تنگ تھا کہ پاؤں دراز کرنا بھی دشوار تھا، پھر بعض اہل تعلق کے بہت زیادہ اصرار کرنے پر ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے، راقم سطور اپنے ایک رفیق درس کے ساتھ جو مولانا کے شاگرد بھی ہیں، کانپور تک مولانا کے ساتھ ہو گیا تھا، اس سفر میں بھی مولانا کی وہی سادگی، بے تکلفی دیکھنے میں آئی، کسی

موقع پر بھی امتیاز و ترفع گوارہ نہ تھا۔

مولانا کی حیات ہی میں چھوٹی صاحبزادی نے جو حافظہ قرآن بھی تھیں اور چند سال قبل مولانا نے ان کی شادی کی تھی، خورد سال بچوں کو چھوڑ کر داغ مفارقت دیا، پھر اہلیہ محترمہ نے بھی ایک طویل علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا، لیکن مولانا ہر موقع پر صابر و شاکر رہے اور کبھی لفظ شکایت زبان پر نہیں آیا۔

مولانا کی تصنیفات کا معاملہ بھی عجیب رہا، بغیر ان کی اجازت کے مختلف مکتبوں سے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، خود مولانا کو بھی ضرورت ہوتی تو خریدنے کی نوبت آتی، مولانا کو ان سے کوئی مادی منفعت حاصل نہ ہو سکی، کبھی تذکرہ بھی آیا تو فرمایا کہ اصل مقصد تو اشاعت ہی ہے۔

تر بیت اولاد کا بھی پورا خیال رہا، صاحبزادہ گرامی قدر مولانا عبدالشہید نعمانی مولانا کے ذوق تحقیق کے وارث ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو مولانا کا پورا جانشین بنائے۔

خالص علمی انہماک و مشغولیت کے باوجود عالم اسلام کے حالات سے باخبر رہتے، کہیں بھی اگر مسلمانوں پر کوئی مصیبت آپڑتی تو مولانا اس کی چوٹ اپنے دل پر محسوس کرتے۔

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”آج کل عالم اسلام پر جو بیت رہی ہے اس سے دل داغ داغ ہے“ ایک جگہ مسلمانوں کے زوال و ادبار سے دل برداشتہ ہو کے لکھتے ہیں، ”حالات ناگفتہ بہ ہیں ہر شخص کو دنیا کی پڑی ہے جیسے کل مرنا نہیں، ارباب اقتدار دولت سمیٹنے میں لگے ہیں، رشوت عام، قتل عام ہے، اللہ رحم فرمائے،

اللّٰهُم ارحم امة محمد صلى الله عليه وسلم۔“

دہلی میں خانقاہ مظہریہ مجددیہ حاضری کے بعد ایک مکتوب میں اپنے تاثر کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں ”خانقاہ میں بڑا سکون محسوس کیا، لیکن کوئی ذکر نہ دیکھا، اولاد بھی انگریزی تعلیم میں ہے، اللہ رحم فرمائے۔“ مہندیان میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ اور ان کے صاحبزادوں کے مزارات پر حاضری ہوئی تو ان الفاظ میں تاثر ظاہر ہوا۔

”اب دنیا بدل گئی، سب مزارات پختہ ہو گئے، دیوبندیوں،

بریلویوں کا فرق مٹ گیا۔“

مولانا کے آخری تین چار سال مسلسل ضعف و علالت میں گزرے، اس کا سلسلہ ۱۳۱۶ھ کے اخیر سے شروع ہو چکا تھا، جامعہ بنوری ٹاؤن سے کئی سال قبل سبکدوشی اختیار فرمائی تھی، کراچی کے ایک مدرسۃ البنات میں اصرار پر بخاری اور طحاوی زیر درس رہیں، لیکن پھر اس کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا، صاحبزادہ گرامی مولانا عبدالشہید نعمانی صاحب کے مکان پر ہی قیام رہا، ابتداء میں تو کچھ مطالعہ و تحقیق اور افادہ کا سلسلہ جاری رہا، بعد میں ضعف اتنا بڑھ گیا کہ اس سے بھی معذوری ہو گئی، بالآخر ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ کی شب کو یہ آفتاب غروب ہو گیا اور مسند علم حدیث سونی ہو گئی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاکِ طینت را

(بلال عبدالحی حسنی ندوی)

حدیث کیا ہے؟

قرآن کریم، دین الہی کی آخری اور مکمل کتاب ہے، جو حضرت خاتم النبیین ﷺ پر نازل کی گئی اور آپ ﷺ کو اس کا مبلغ اور معلم بنا کر دنیا میں مبعوث کیا گیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کتاب مقدس کو اوّل سے آخر تک لوگوں کو سنایا، لکھوایا، یاد کرایا اور بخوبی سمجھایا اور خود اس کے جملہ احکام و تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر امت کو دکھایا، آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ حقیقت میں قرآن مجید کی قوی اور عملی تفسیر ہے اور آپ ﷺ کے ان ہی اقوال، اعمال اور احوال کا نام حدیث ہے۔

لفظ ”حدیث“ عربی زبان میں وہی مفہوم رکھتا ہے، جو ہم اردو میں گفتگو، کلام یا بات سے مراد لیتے ہیں، چونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام گفتگو اور بات کے ذریعہ پیام الہی کو لوگوں تک پہنچاتے، اپنی تقریر اور بیان سے کتاب اللہ کی شرح کرتے اور خود اس پر عمل کر کے اس کو دکھاتے تھے، اسی طرح جو چیزیں آپ ﷺ کے سامنے ہوتیں اور آپ ﷺ ان کو دیکھ کر یا سن کر خاموش رہتے تو اسے بھی جزء دین سمجھا جاتا تھا کیونکہ اگر وہ امور منشاء دین کے منافی ہوتے تو آپ ﷺ یقیناً ان کی اصلاح کرتے یا منع فرمادیتے، لہذا ان سب کے مجموعہ کا نام ”احادیث“ قرار پایا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال، اعمال اور احوال کو حدیث سے تعبیر کرنا خود ساختہ اصطلاح نہیں، بلکہ خود قرآن کریم ہی سے مستنبط ہے، قرآن کریم

میں دین کو نعمت فرمایا ہے اور اس نعمت کی نشر و اشاعت کو ”حدیث“ سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

واذكروا نعمة الله عليكم وما أنزل عليكم من الكتب
والحكمة يعظكم به (البقرة: ۲۳۱)

”اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو اور جو تم پر کتاب اور حکمت کو نازل فرمایا کہ تم کو اس کے ذریعہ نصیحت فرمائے۔“
اور تکمیل دین کے سلسلہ میں فرمایا ہے:

اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي. (المائدة: ۳)

”آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا
اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔“

دیکھئے ان دونوں آیتوں میں قرآن حکیم نے دین کو ”نعمت“ کہا ہے
اور سورہ ”الضحیٰ“ میں آنحضرت ﷺ کو اسی نعمت کے بیان کرنے کا ان
الفاظ میں حکم دیا ہے:

”وأما بنعمة ربك فحدث“ (الضحیٰ: ۱۱)

”اور اپنے رب کی نعمت کو بیان کیجئے۔“

پس آنحضرت ﷺ کی اسی تحدیث نعمت کو ”حدیث“ کہتے ہیں۔

یہی نہیں، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اقوال، اعمال اور احوال کے
لئے خود قرآن مجید میں بھی متعدد مقامات پر ”حدیث“ ہی کا لفظ استعمال کیا گیا
ہے، چنانچہ سورہ ”الذاریات“ میں حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا

تذکرہ اس طرح شروع ہوتا ہے ہل اٹک حدیث ضیف ابراہیم المکرمین (الذاریات: ۲۴) اور حضرت موسیٰ علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حالات میں ایک جگہ نہیں دو جگہ فرمایا ہے ہل اٹک حدیث موسیٰ (طہ: ۹)، (النازعات: ۱۵) خود آنحضرت ﷺ کے قول مبارک کے لئے بھی قرآن مجید میں ”حدیث“ کا لفظ موجود ہے۔

وإذ أمر النبي إلى بعض أزواجه حديثاً (التحریم: ۳)
”اور جب چھا کر کہی نبی نے اپنی کسی بی بی سے ایک بات۔“

حدیث کی دینی حیثیت: حدیث شریف کا دین میں کیا درجہ ہے اس کو ذہن نشین کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کی حسب ذیل حیثیات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، جن کو قرآن پاک نے نہایت صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔
آپ ﷺ مبلغ تھے

يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (المائدة: ۶۷)
”اے رسول! پہنچا دیجئے جو کچھ اتارا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے۔“

آپ ﷺ مراد الہی کے مبین یعنی بیان کرنے والے ہیں
وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴)
”اور آپ پر بھی ہم نے یہ یادداشت نازل کی تاکہ جو کچھ ان کی

طرف اتارا گیا ہے آپ اس کو کھول کر لوگوں سے بیان کر دیں۔“

آپ ﷺ معلم کتاب و حکمت ہیں

لقد من الله على المؤمنين إذ بعث فيهم رسولا من أنفسهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتب والحكمة.

(آل عمران: ۱۶۴)

”بے شک اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر کہ بھیجا ان میں

رسول انہیں میں سے جو پڑھتا ہے ان پر اس کی آیتیں اور ان کو

سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اللہ اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“

تحلیل و تحریم یعنی اشیاء کو حلال و حرام کرنا آپ ﷺ کے منصب میں داخل تھا

ويحلّ لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث (الاعراف: ۱۵۷)

”اور وہ ان کے لئے پاک چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور گندی

چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں۔“

قاتلوا الذين لا يؤمنون بالله ولا باليوم الآخر ولا يحرمون ما

حرم الله ورسوله (التوبة: ۲۹)

”لڑو! ان لوگوں سے جو یقین نہیں رکھتے اللہ پر، پچھلے دن

پر، اور نہیں حرام سمجھتے ان چیزوں کو جن کو حرام کیا اللہ اور اس

”کے رسول نے۔“

آپ ﷺ امت کے تمام معاملات اور فیصلوں میں قاضی ہیں
وما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمراً أن يكون
لهم الخيرة من أمرهم، ومن يعص الله ورسوله فقد ضلّ ضلالاً
مبيناً. (الاحزاب: ۳۶)

”اور گنجائش نہیں کسی ایماندار مرد کے لئے اور نہ کسی ایماندار
عورت کے لئے جبکہ فیصلہ کر دے اللہ اور اس کا رسول کسی
معاملہ کا کہ ان کو اپنے اس معاملہ میں کوئی اختیار رہے اور جو
کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو بیشک وہ صریح
طور پر گمراہ ہو گیا۔“

آپ ﷺ امت کے تمام جھگڑوں اور قضیوں میں حکم ہیں
فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم، ثم
لا يجدوا في انفسهم حرجاً مما قضيت، ويسلموا تسليماً.
(النساء: ۶۵)

”سو قسم ہے تیرے رب کی یہ مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ
تمہیں ہی حکم نہ بنائیں اس جھگڑے میں کہ جو ان کے باہم ہو
پھر جو تم فیصلہ کرو اس سے یہ اپنے جی میں خفگی بھی نہ محسوس کریں
اور تسلیم کر کے مان لیں۔“

إنا أنزلنا إليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما أراك

اللہ (النساء: ۱۰۵)

”بیشک ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے باہم جو کچھ اللہ تمہیں نبھائے اس سے فیصلہ کیا کرو۔“

آپ ﷺ کی ذات قدسی صفات میں ہر مومن کے لئے اسوۂ حسنہ ہے

لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر وذكر الله كثيراً (الاحزاب: ۲۱)

”بیشک تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں عمدہ نمونہ عمل ہے، اس شخص کے لئے کہ جو اللہ اور روزِ آخرت سے آس لگائے ہوئے ہو اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہو۔“

آپ ﷺ کی اتباع سب پر فرض ہے

فأمنوا بالله ورسوله النبي الأمي الذي يؤمن بالله وكلماته واتبعوه (الاعراف: ۱۵۸)

”سو ایمان لے آؤ اللہ پر اور اس کے نبی امی پر کہ جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے تابع ہو۔“

قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم (آل عمران: ۳۱)

”آپ کہہ دیجئے اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری اتباع کرو کہ

اللہ تم سے محبت رکھے اور تمہارے گناہ بخش دے۔“

جو کچھ آپ ﷺ دیں اس کو لینا اور جس چیز سے منع فرمائیں اس سے باز رہنا ضروری ہے

وما اتکم الرسول فخذوه وما نہکم عنه فانتهوا (حشر: ۷)

”اور جو دے تم کو رسول سولے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو۔“

آپ ﷺ کی اطاعت تمام مسلمانوں پر فرض ہے

یأیہا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (النساء: ۵۹)

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی“

ہدایت آپ ﷺ کی اطاعت سے وابستہ ہے

وإن تطیعوه تہتدوا (النور: ۵۴)

”اور اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو ہدایت پر آ جاؤ گے“

ان آیات سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے جس قدر امت کو

ہدایتیں دیں، جو جو چیزیں ان سے بیان فرمائیں اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے

ذیل میں جو کچھ ارشاد فرمایا، جن چیزوں کو حلال اور جن کو حرام ٹھہرایا، باہمی معاملات

و قضا یا میں جو کچھ فیصلہ فرمایا، منازعات و خصومات کو جس طرح چکایا، ان سب کی

حیثیت دینی اور تشریحی ہے، یہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کی پوری زندگی امت کے

لئے بہترین نمونہ عمل ہے جس کی اتباع اور پیروی کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، آپ

ﷺ کی اطاعت ہر امتی پر فرض ہے جو آپ ﷺ حکم دیں، اس کو بجالانا اور جس سے منع کریں اس سے رک جانا ہر مومن کے لئے لازم اور ضروری ہے، مختصر یہ کہ آپ ﷺ کی اطاعت ہی حقیقت میں حق تعالیٰ کی اطاعت ہے، چنانچہ قرآن کریم میں صاف تصریح ہے۔

ومن يطع الرسول فقد أطاع الله (النساء: ۸۰)

”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے بلاشبہ اللہ ہی کی اطاعت کی“

ظاہر ہے کہ وضو، غسل، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، درود، دعا، جہاد، ذکر الہی، اسی طرح نکاح، طلاق، بیع و شراء، فصل تضاویٰ و خصومات، اخلاق و معاشرت، سیاسیات، ملت، غرض جملہ احکام دین کے متعلق کلی احکام قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن ان احکام کی تشریح، ان کے جزئیات کی تفصیل اور ان کی عملی تشکیل آنحضرت ﷺ کے اقوال و اعمال اور آپ ﷺ کے احوال کے جانے بغیر بالکل نہیں ہو سکتی، اس لئے اللہ کی اطاعت بغیر رسول اللہ ﷺ کی اتباع اور اطاعت کے ناممکن اور محال ہے۔

کتابت حدیث

عرب کی قوم عام طور پر امی یعنی بے پڑھی لکھی تھی اور ان میں کسی قسم کی مکتوبی یا زبانی تعلیم کا رواج نہ تھا، چنانچہ قرآن کریم نے ان کو امین ہی فرمایا ہے، خود آنحضرت ﷺ کے متعلق بھی قرآن پاک میں ”النبي الأمي“ وارد ہے، ساتھ ہی یہ بھی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اہل عرب کا حافظہ نہایت ہی قوی تھا، وہ اپنے تمام شجرہائے نسب، اہم تاریخی واقعات، جنگی کارنامے، بڑے بڑے خطبے، لے لے

قصیدے اور نظمیں سب زبانی یاد رکھتے تھے، قرآن پاک نازل ہوا تو عرب کی عام عادت کے مطابق خود آنحضرت ﷺ اور صحابہ نے اس کو بر زبان یاد رکھا اور اس سلسلہ کو ہمیشہ کے لئے جاری فرمادیا، اسی لئے ارشاد ہے:

بل هو آیت بینت فی صدور الذین أوتوا العلم (العنکبوت: ۱۰)

”بلکہ یہ قرآن کھلی کھلی آیتیں ہیں، ان لوگوں کے سینے میں جن کو علم دیا گیا ہے“

تاہم چونکہ قرآن مجید تمام تر معجزہ ہے اور اس کا لفظ لفظ وحی الہی ہے، جس میں کسی ایک لفظ کی بجائے دوسرے اس کے ہم معنی اور مترادف لفظ کے لانے کی بھی گنجائش نہیں ہے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے شروع ہی سے اس کی کتابت کا بھی اہتمام فرمایا، چنانچہ معمول مبارک تھا کہ جس وقت کوئی آیت اترتی آپ ﷺ اسی وقت لوگوں کو یاد کرا دیتے اور کسی کا تب کو بلا کر اس کو لکھوا دیتے، مگر اصل توجہ اس کے حفظ و تلاوت پر مرکوز تھی اور کتابت مزید برآں تھی۔

برخلاف اس کے حدیث معجزہ نہ تھی، اس کے الفاظ نہیں بلکہ معانی و مطالب آپ ﷺ کے قلب مبارک پر وارد ہوتے تھے اور آپ ﷺ اس کو اپنے لفظوں میں ادا فرماتے تھے اور یہ الفاظ بھی حسب ضرورت مختلف ہوتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ کو مختلف طبائع اور مختلف مذاق کے لوگوں کو سمجھانا پڑتا تھا، اسی بنا پر اس کے لفظوں کی بعینہ تلاوت کا حکم نہ تھا۔ (۱)

(۱) خوب سمجھ لیجئے یہی فرق ہے حدیث قولی اور قرآن میں، کہ قرآن اپنے الفاظ و معنی دونوں کے اعتبار سے معجزہ ہے، حدیث معجزہ نہیں، قرآن میں ایک لفظ بلکہ ایک حرف بلکہ ایک نقطہ کا بھی تغیر و تبدل جائز نہیں، لیکن حدیث میں روایت بالمعنی یعنی اصل مقصود کو جدا گانہ الفاظ میں بیان کرنے کی گنجائش ہے، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

علاوہ ازیں آپ ﷺ کو اپنی قوم کی قوت حافظہ اور یادداشت پر پورا پورا اعتماد اور وثوق تھا، کیونکہ وہ جو کچھ سنتے تھے ان کے صفحہ حافظہ پر ثبت ہو جاتا تھا، اس لئے ابتداء اسلام میں کتابت حدیث کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، بلکہ صرف زبانی روایت کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی یہ وعید بھی سنادی گئی کہ آپ ﷺ کے بارے میں عدا کسی قسم کی غلط بیانی یا دروغ زنی کا مطلب دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنانا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی زبانی آنحضرت ﷺ کی یہ ہدایت بھی منقول ہے کہ

﴿لَا تَكْتُبُوا عَنِّي، وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُحْهُ،

وَحَدِّثُوا عَنِّي وَلَا حَرَجَ، وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَّبِعُوا

مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ﴾ (باب الثبوت في الحديث وحكم كتابة العلم)

”مجھ سے کچھ نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھ

لیا ہے تو اسے مٹا دے، اور مجھ سے حدیثیں بیان کرو اس میں کچھ

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) بالفاظ دیگر قرآن و حدیث میں وہی فرق ہے جو نامہ و پیام میں ہوتا ہے، پیام میں اگر آپ کا پیامی آپ کا منشا اور مافی الضمیر صحیح طور سے مرسل الیہ تک پہنچا دیتا ہے، تو پیام رسانی کا مقصد حاصل ہو گیا خواہ پیام رساں اسے آپ کے الفاظ میں نہ پہنچائے، بلکہ اکثر اوقات اس کے لئے الفاظ میں تبدیلی کرنا ضروری ہو جاتا ہے خصوصاً جبکہ آپ کی اور آپ کے مخاطب کی زبان مختلف ہو اور آپ کا پیغام رساں دونوں زبانوں سے واقفیت رکھتا ہو، اس صورت میں آپ اپنا مقصد اس سے اپنی زبان میں کہیں گے اور وہ اسے مرسل الیہ کی زبان میں ادا کرے گا، اگر اس موقع پر وہ آپ ہی کے الفاظ نقل کر دے تو پیغام کا مقصد فوت ہو کر رہ جائے گا، اسی طرح اگر آپ کا پیغام رساں ذہین ہے اور مختصر الفاظ میں مطلب سمجھ جاتا ہے لیکن جسے پیغام دیا جا رہا ہے وہ نہایت ہی غبی اور کم فہم ہے تو اس صورت میں آپ کے لئے اپنے پیغام رساں سے مختصر لفظوں میں اپنا مطلب کہہ دینا کافی ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرسل الیہ کو اس قدر واضح الفاظ میں اپنا مطلب سمجھائے کہ وہ اس کے لئے اچھی طرح میں سمجھ میں آجائے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حرج نہیں اور جس شخص نے میرے متعلق قصداً جھوٹ بولا،

اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔“

اگرچہ امام بخاری (۱) اور دیگر محدثین کے کے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں بلکہ معلول ہے اور ان کی تحقیق میں یہ الفاظ آنحضرت ﷺ کے نہیں بلکہ خود ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے ہیں، جن کو غلطی سے راوی نے مرفوعاً نقل کر دیا ہے، لیکن بالفرض اگر اس روایت کو موقوف نہیں بلکہ مرفوع ہی صحیح تسلیم کر لیا جائے، تب بھی یہ ممانعت وقتی اور عارضی تھی، جو اس زمانے میں کچھ عرصہ کے لئے خاص طور پر حفاظت قرآن کے سلسلہ میں کر دی گئی تھی، جس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) لیکن ”نامہ“ کی صورت اس سے بالکل مختلف ہے، یہاں ان ہی الفاظ کو مکتوب الیہ تک پہنچانا ضروری ہے، اگر قصداً سچ میں خط کو چاک کر ڈالا اور اسی مضمون کا دوسرا خط تحریر کر دیا، یا اس کا مطلب ہی بلا کم و کاست زبانی جا کر بیان کر دیا تو وہ کسی طرح اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوا، بلکہ الٹا خیانت مجرمانہ کا مرتکب اور بددیانتی کا طرم ٹھہرا۔

”حدیث قولی“ بھی حق تعالیٰ کی وحی یا الہام یا ارادت ہے، مگر اس کی نوعیت پہلی قسم کی ہے جس میں الفاظ کی بعینہ ادا نگینی ضروری نہیں، اور قرآن پاک کی نوعیت دوسری قسم کی ہے، یہاں اصل الفاظ ہیں جو روح القدس کے ذریعہ حق تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے قلب اقدس پر نازل ہوئے اور آپ ﷺ کے ذریعے امت تک پہنچے، ان میں نہ روایت بالمعنی کی اجازت ہے نہ کسی قسم کے تغیر و تبدل کا اختیار، ہاں ترجمہ اور تفسیر کی اجازت ہے لیکن اس کو کلام الہی نہیں کہا جائے گا۔

(۱) چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری بشرح صحیح البخاری میں لکھتے ہیں:

ومنہم من اعل حدیث ابی سعید، و قال الصواب وقفہ علی ابی سعید، قالہ البخاری وغیرہ۔
(باب کتاب العلم)

”اور بعض محدثین نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت کو معلول بتایا ہے اور کہا کہ صحیح یہ ہے کہ یہ روایت حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے، چنانچہ امام بخاری وغیرہ نے یہی بیان کیا ہے۔

چونکہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قرآن کریم کے علاوہ ”جوامع الکلم“ بھی عطا فرمائے تھے جو اپنے ایجاز لفظی و معنوی کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ تھے، اس لئے اندیشہ تھا کہ یہ امی لوگ جو نئے قرآن سے آشنا ہوئے ہیں، کہیں دونوں کو خلط ملط نہ کر دیں، اس بنا پر غایت احتیاط کے مد نظر آپ ﷺ نے قرآن مجید کے سوا ہر چیز کے لکھنے کی ممانعت کر دی اور عام حکم دیدیا کہ اگر آپ ﷺ سے قرآن مجید کے علاوہ اور کچھ لکھ لیا گیا ہے، تو اس کو مٹا دیا جائے۔

احادیث فعلیہ

احادیث فعلیہ میں تمام احکام و عبادات کا عملی نقشہ اور ان کی تشکیل تھی، عملی چیزیں لکھوانے کی بہ نسبت عملی طور پر کر کے دکھلانے اور پھر لوگوں سے اس کے مطابق عمل کروانے سے زیادہ ذہن نشین ہوتی ہیں، اس لئے آپ ﷺ نے ان کے بارے میں یہی طریقہ اختیار فرمایا اور ہدایت کر دی کہ صَلَّوْا کَمَا رَأَيْتُمُونِي اَصْلِي۔ (صحیحین)

”جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا اسی طرح تم بھی نماز پڑھا کرو۔“

اور حجۃ الوداع میں رمی جمار کرتے ہوئے فرمایا:

خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَم فَيَا نِي لَا أُدْرِي لِعَلِي لَا أَحْجَ بَعْدَ

حَجَّتِي هَذِهِ (صحیح مسلم)

”مجھ سے تم اپنے حج کے طریقے سیکھ لو کیونکہ پتا نہیں شاید میں

اس حج کے بعد دوسرا حج نہ کر سکوں۔“

بہت سی چیزیں جن میں آپ ﷺ نے کسی قسم کی اصلاح و ترمیم کی ضرورت نہ سمجھی اور ان کو ہوتے دیکھ کر آپ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی اور اس طرح اپنے اس طرز عمل سے آپ ﷺ نے ان کی تقریر یعنی اثبات فرمایا کہ باوجود ان چیزوں کے آپ ﷺ کے علم میں آجانے کے آپ ﷺ نے ان پر کسی قسم کا انکار نہیں کیا، ایسی حدیثیں تقریری کہلاتی ہیں، اب ظاہر ہے کہ اس قسم کی روزمرہ کی باتیں اگر آپ ﷺ قلمبند کرنے کا حکم دیتے، تو ایک طول طویل اور اونٹوں پر لادنے والی ضخیم کتاب بنتی، جس کی تکلیف اس وقت کے امیوں کے لئے تکلیف مالا بلاق سے کم نہ تھی، خصوصاً جبکہ اس وقت پوری قوم میں لکھنا جاننے والوں کی تعداد اتنی تھوڑی تھی کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے اور کاغذ کی قلت کا یہ عالم تھا کہ لوگ قرآن پاک کو بھی کجھور کی شاخوں، درختوں کے پتوں، اونٹ اور بکری کے شانوں کی ہڈیوں، جانوروں کے چمڑوں اور کھالوں، پالان کی لکڑیوں اور چوڑے چکلے اور پتلے پتلے پتھروں پر لکھا کرتے تھے۔

غرض اس وقت حفاظتِ دین کے سلسلہ میں وہی آسان اور سادہ طریقہ اختیار کیا گیا، جو اس عہد میں اہل عرب کا فطری اور مروج طریقہ تھا، قرآن مجید جو دین کی تمام بنیادی اور اساسی تعلیمات پر مشتمل اور جملہ عقائد و احکام کے متعلق کلی ہدایات کا حامل ہے، اس کا لفظ لفظ لوگوں نے زبانی یاد کیا، مزید احتیاط کے لئے معتبر کتابوں سے خود آنحضرت ﷺ نے اس کو لکھوایا، ”حدیث شریف“ جو شرع اسلامی کی تمام اعتقادی اور عملی تفصیلات پر حاوی ہے، اس کا قوی حصہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی قومی عادت اور رواج کے مطابق اس سے

بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا کہ جس اہتمام کے ساتھ وہ اس سے پہلے اپنے خطیبوں کے خطبے، شاعروں کے قصیدے اور حکماء کے مقولے یاد رکھا کرتے تھے اور اس کے عملی حصے پر فوراً تعامل اور عملدرآمد شروع کر دیا گیا، ظاہر ہے اس وقت میں اس سے زیادہ اور کیا کیا جاسکتا تھا۔

لیکن بعد کو جبکہ قرآن مجید کا کافی حصہ نازل ہو چکا اور عام طور پر لوگ قرآن کے ذوق آشنا ہو گئے اور اس بات کا اندیشہ بالکل جاتا رہا کہ ”کلام الہی“ کے ساتھ حدیث کے الفاظ مل جائیں گے، ادھر غزوہ بدر کے بعد مدینہ میں بہت سے لوگوں نے لکھنا بھی سیکھ لیا، تو پھر کتابت حدیث کی اجازت دیدی گئی۔ چنانچہ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

كَانَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ يَجْلِسُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَيَسْمَعُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ الْحَدِيثَ فَيُعْجِبُهُ وَلَا يَحْفَظُهُ، فَشَكَا ذَلِكَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي لَا أَسْمَعُ مِنْكَ الْحَدِيثَ فَيُعْجِبُنِي وَلَا أَحْفَظُهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اسْتَعْنِ

بِیْمَانِکَ وَأَوْ مَا بَیْدُهُ لِلْخَطِّ. (۱)

”ایک انصاری صحابی آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں بیٹھتے، آپ ﷺ کی باتیں سنتے اور بہت پسند کرتے، مگر یاد نہ رکھ پاتے، آخر انہوں نے اپنی یادداشت کی خرابی کی شکایت آنحضرت ﷺ سے کی کہ یا رسول اللہ ﷺ میں آپ

(۱) جامع ترمذی، باب ماجاء فی الرخصة فی کتابیہ العلم۔

ﷺ سے حدیث سنتا ہوں وہ مجھے اچھی لگتی ہے مگر میں اسے یاد نہیں رکھ سکتا، اس پر آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ ”اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو“ اپنے دست مبارک سے ان کو لکھنے کی طرف اشارہ کیا۔

اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے خدمت نبوی میں گزارش کی کہ یا رسول اللہ! انا نسمع منك أشياء فنكتبها ”یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ ﷺ کی فرمودہ باتیں سن کر لکھ لیتے ہیں“ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اکتبوا ولا حرج (۱) ”لکھ لیا کرو کچھ حرج نہیں“

اور سنن ابی داؤد اور مسند دارمی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

كنت أكتب كل شيء أسمعه من رسول الله ﷺ أريد حفظه، فنهتني قريش، وقالوا: تكتب كل شيء تسمعه ورسول الله ﷺ بشريتكلم في الغضب والرضا، فأمسكت عن الكتابة فذكرت ذلك إلى رسول الله ﷺ فأومأ بأصبعه إلى فيه، فقال اكتب فوالذي نفسي بيده ما

(۱) منتخب كنز العمال ج ۴ ص ۵۸ بحوالہ حکیم ترمذی، طبرانی، سمویہ، تھقید العلم للخلیب، یہ کتاب مصر میں امام احمد بن حنبل کی مسند کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے۔

یخرج منه الا حق. (۱)

”میں رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کرنے لئے اس کو لکھ لیتا تھا، پھر قریش نے مجھ کو منع کیا اور کہنے لگے کہ تم جو بات سنتے ہو لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ ﷺ بشر ہیں، غصہ میں بھی کلام فرماتے ہیں اور خوشی میں بھی، یہ سن کر میں نے لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا، تو آپ ﷺ نے اپنی انگشت سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمانے لگے کہ تم لکھو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس سے بجز حق کے کچھ نہیں نکلتا۔“

بلکہ حکیم ترمذی اور سمویہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور طبرانی نے معجم کبیر میں اور حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ

قیّدوا العلم بالکتاب. (۲)

”علم کو قید کتابت میں لے آؤ۔“

آنحضرت ﷺ کی طرف سے املا

خود آنحضرت ﷺ نے بھی متعدد مواقع پر ضروری احکام و ہدایات

کو قلمبند کروایا ہے۔

(۱) سنن ابی داؤد، باب کتابۃ العلم، مسند داری، باب من رخص فی کتابۃ العلم۔

(۲) منتخب کنز العمال ج ۳ ص ۶۹۔

(۱) چنانچہ صحیح بخاری اور سنن ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ فتح مکہ کے سال قبیلہ خزاعہ کے لوگوں نے بنی لیث کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، جب اس واقعہ کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سوری پر سوار ہو کر خطبہ دیا، جس میں حرم محترم کی عظمت و حرمت اور اس کے آداب کی تفصیل اور قتل کے سلسلہ میں دیت و قصاص کا بیان تھا، خطبہ سے فراغت ہوئی تو یمن کے ایک صحابی حضرت ابو شاہ رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر درخواست کی کہ اکتبوا لسی یا رسول اللہ ”یا رسول اللہ یہ خطبہ میرے لئے لکھوا دیجئے“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست منظور فرما کر حکم دیا اکتبوا ابی شاہ ”ابو شاہ کے لئے خطبہ لکھ دیا جائے“ (۱)

(۲) اور حافظ ابن عبد البر ”جامع بیان العلم وبلہ“ میں لکھتے ہیں کہ وکتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الصدقات والذیات والفرائض والسنن لعمر بن حزم وغیرہ (۲)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم وغیرہ کے لئے صدقات، دیات، فرائض اور سنن کے متعلق ایک کتاب تحریر کروائی تھی۔“

حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ ہجری میں اہل نجران پر عامل بنا کر بھیجا تھا، اس وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی، (۳) یہ نوشتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) صحیح بخاری، باب کتابیہ العلم، اور باب کیف تعرف لفظہ اہل مکہ، جامع ترمذی، باب ما جاء فی الرخصة فی کتابیہ العلم۔

(۲) جامع بیان العلم، باب ذکر الرخصة فی کتاب العلم۔

(۳) الاستیعاب اور تہذیب التہذیب میں ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

نے ان کو جب یہ یمن جانے لگے تو حوالہ کیا تھا، سنن نسائی میں ہے:

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَتَبَ إِلَى أَهْلِ الْيَمَنِ كِتَاباً فِيهِ الْفَرَائِضُ وَالسَّنَنُ وَالذِّيَّاتُ وَبَعَثَ بِهِ مَعَ عَمْرٍو بَنَ حَزْمَ فَقَرَأَ عَلَى أَهْلِ الْيَمَنِ (ذَكَرَ حَدِيثَ عَمْرٍو بَنَ حَزْمَ فِي الْعُقُولِ)

”رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کی طرف ایک نوشتہ تحریر کیا تھا جس میں فرائض، سنن، اور خوبیا کے احکام تھے اور آپ ﷺ نے یہ نوشتہ حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے ساتھ روانہ کیا تھا، چنانچہ وہ اہل یمن کے سامنے پڑھا گیا“

اس کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

﴿مِنْ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ ﷺ﴾ إِلَى شُرَحْبِيلَ بْنِ عَبْدِ كَلَالٍ وَنُعَيْمِ بْنِ عَبْدِ كَلَالٍ وَالْحَارِثِ بْنِ عَبْدِ كَلَالٍ، قِيلَ ذِي رُعَيْنٍ وَمَعَا فَرِ وَهْمَدَانَ، أَمَا بَعْدُ ﴿(سنن نسائی)

اور ”کتاب الجراح“ کی ابتداء میں یہ تحریر تھا:

هَذَا بَيَانٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ“ (المائدة: ۱) پھر یہاں سے لیکر إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (المائدة: ۴) تک مسلسل آیات درج تھیں، اس کے بعد لکھا تھا ہذا کتاب الجراح، فِي النَّفْسِ مَائَةٌ مِنَ الْإِبِلِ الْخ (سنن نسائی)

امام ابن شہاب زہری کا بیان ہے کہ یہ کتاب چمڑے پر تحریر تھی اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے پوتے ابو بکر بن حزم کے پاس موجود تھی وہ یہ کتاب میرے پاس بھی

لے کر آئے تھے اور میں نے اس کو پڑھا تھا۔ (سنن نسائی)

حافظ ابن کثیر اس کتاب کے بارے میں ارقام فرماتے ہیں:

فهذا الكتاب متداول بين أئمة الإسلام قديماً و
حديثاً، يعتمدون عليه، ويفزعون في مهمات هذا الباب إليه،
كما قال يعقوب بن سفيان لا أعلم في جميع الكتب كتاباً
أصح من كتاب عمرو بن حزم، كان أصحاب رسول الله
ﷺ يرجعون إليه ويدعون أرائهم.

”یہ کتاب عہد قدیم و عہد جدید دونوں میں ائمہ اسلام کے مابین
متداول رہی ہے جس پر وہ اعتماد کرتے اور اس باب کے مہم مسائل
میں رجوع کرتے رہے ہیں، چنانچہ یعقوب بن سفيان کا بیان ہے
کہ میرے علم میں تمام کتابوں میں کوئی کتاب عمرو بن حزم کی
کتاب سے زیادہ صحیح نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب
اس کی طرف رجوع کرتے اور اپنی رائیوں کو چھوڑ دیتے تھے۔“

چنانچہ حسب تصریح حافظ ابن کثیر، سعید بن مسیب سے بہ صحت منقول ہے
کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انگیوں کی دیت کے بارے میں اسی کتاب کی طرف رجوع کیا
تھا۔ (۱) اور دارقطنی نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز جب
خليفة ہوئے تو انھوں نے زکوٰۃ کے متعلق آنحضرت ﷺ کی تحریر کو معلوم کرنے کی

(۱) تنقيح الاظفار في علوم الآثار، از محمد بن ابراهيم المعروف بابن الوزير اليماني، ج ۲ ص ۳۵۱، طبع السعاده مصر

۱۳۶۱ھ، یہ کتاب توضیح الافکار کے ساتھ طبع ہوئی ہے جو اس کی حامل الحسن شرح ہے۔

غرض سے مدینہ منورہ میں اپنا آدمی روانہ کیا تھا، جس کو ایک تحریر تو آل عمرو بن حزم کے پاس ملی جو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن حزم کو صدقات کے بارے میں لکھوائی تھی اور دوسری آل عمر بن خطاب ؓ کے پاس دستیاب ہوئی، جو حضرت عمر ؓ نے اس سلسلہ میں اپنے تمام عمال کے نام لکھی تھی، ان دونوں نوشتوں کا مضمون واحد تھا، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے تمام عمال اور ولایت کے نام فرمان جاری کر دیا کہ جو کچھ ان دونوں کتابوں میں تحریر ہے، اسی کے مطابق عمل درآمد کیا جائے۔ (۱)

اور حافظ جمال الدین زلیعی ”نصب الرأیہ“ میں بعض حفاظ حدیث سے

ناقل ہیں کہ

نسخة كتاب عمرو بن حزم تلقاها الأئمة الأربعة بالقبول وهي

متوارثة كنسخة عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده. (۲)

”عمرو بن حزم (ؓ) کی کتاب کے نسخہ کو چاروں ائمہ نے قبول

کیا ہے اور یہ نسخہ بھی ”نسخہ عمرو بن شعیب عن أبيه عن

جده“ کی طرح سے متوارث ہے۔“

حدیث کی بیشتر کتابوں میں اس نسخہ کی جتہ جتہ حدیثیں منقول ہیں،

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ

”اس کو مسند ابھی روایت کیا گیا ہے اور مرسل بھی، چنانچہ جن

حفاظ و ائمہ حدیث نے اس کو مسند روایت کیا ہے وہ حسب

(۱) سنن دارقطنی، باب زکوۃ الابل والغنم۔

(۲) نصب الرأیہ لتخریج احادیث الہدایہ ج ۳ ص ۳۲۲ طبع مصر ۱۳۵۰ھ۔

ذیل ہیں، امام نسائی نے اپنی سنن میں، امام احمد نے اپنی مسند میں، امام ابوداؤد نے کتاب المراسیل میں، ابو محمد عبداللہ ابن عبدالرحمن دارمی، ابویعلیٰ موصلی، اور یعقوب بن سفیان نے اپنی اپنی مسندوں میں، نیز حسن بن سفیان فسوی، عثمان بن سعید دارمی، عبداللہ بن عبدالعزیز بغوی، ابو زرعدمشقی، احمد بن الحسن بن عبد الجبار الصوفی الکبیر، حامد بن محمد بن شعیب بلخی اور حافظ طبرانی نے اور ابو حاتم بن حبان بستی نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور یہی لکھتے ہیں کہ ”ہو حدیث موصول الإسناد حسن۔“

رہی مرسل روایت سو وہ تو بہت سے طریقوں سے منقول ہے۔ (۱)
موطا امام مالک میں بھی اس نسخہ سے حدیثیں مروی ہیں اور حاکم نے ”المستدرک علی الصحیحین“ کی صرف ”کتاب الزکوٰۃ“ میں اس نسخہ سے تریبہ حدیثیں نقل کی ہیں، اسی طرح سنن دارقطنی اور سنن بیہقی وغیرہ میں بھی مختلف ابواب میں اس کی حدیثیں منقول ہیں۔

(۳) سنن دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کی طرف حارث بن عبدکلال اور ان کے ساتھ معافروہدآن کے دیگر یمینوں کے نام ایک تحریر لکھی تھی جس میں زرعی پیداوار کی بابت زکوٰۃ کے احکام درج تھے۔ (۲)

(۱) تنقیح الانظار ج ۲ ص ۱۵۰ و ۱۵۱۔ (۲) سنن دارقطنی، باب فی قدر الصدقۃ فیما اخرجت الارض۔

(۴) اہل یمن کے نام احکام زکوٰۃ کے متعلق آنحضرت ﷺ کی ایک تحریر کا ذکر امام شعبی نے بھی کیا ہے، چنانچہ مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ کی کتاب الزکوٰۃ میں اس نوشتہ کی متعدد حدیثیں امام شعبی کی روایت سے منقول ہیں۔ (۱)

(۵) ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ”کتاب الصدقة“ تحریر فرمائی اور اس کو آپ ﷺ نے ابھی اپنے عاتلوں کی طرف روانہ نہ کیا تھا کہ رحلت فرما گئے، یہ کتاب آپ ﷺ کی تلوار کے ساتھ رکھی تھی، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل کیا، جب وہ بھی وفات پا گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق عمل درآمد کیا یہاں تک کہ ان کی بھی وفات ہو گئی۔ (۲) ابوداؤد اور ترمذی نے اس نوشتہ کی حدیثیں بھی نقل کی ہیں اور امام ترمذی نے تو اس کو روایت کر کے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ

والعمل علی هذا الحديث عند عامة أهل العلم .

”عامہ علماء کا عمل اسی حدیث پر ہے۔“

آنحضرت ﷺ کا یہ نوشتہ ان دونوں کتابوں کے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہ، سنن دارمی اور سنن دارقطنی وغیرہ دیگر کتب حدیث میں بھی مروی ہے، (۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات پر یہ تحریر آپ کے خاندان میں محفوظ رہی، چنانچہ امام زہری کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اس کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ہر دو

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۱۰۱ و ۱۰۲ طبع لبنان۔

(۲) سنن ابی داؤد، باب فی زکوٰۃ السامۃ، جامع ترمذی، باب ما جاء فی زکوٰۃ الابل والغنم۔

(۳) ملاحظہ ہو، مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۱، سنن دارمی، باب زکوٰۃ الابل، سنن دارقطنی، باب زکوٰۃ الابل والغنم۔

صاحبزادگان عبداللہ اور سالم سے لیکر نقل کر لیا تھا، امام زہری کہتے ہیں ”میں نے اس نسخہ کو زبانی یاد کر لیا تھا“۔ (۱)

(۶) سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن حکیم ؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی وفات سے ایک ماہ قبل قبیلہ جہینہ کی طرف یہ لکھ کر بھیجا تھا کہ مردار کی کھال اور پٹھوں کو کام میں نہ لایا جائے، امام ترمذی کی روایت میں زمانہ تحریر وفات نبوی سے دو ماہ قبل مذکور ہے۔ (۲)

(۷) حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام ابو جعفر محمد بن علی (باقر) سے بسند نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تلوار کے دستہ میں ایک صحیفہ رکھا ہوا ملا، جس میں حدیثیں لکھی ہوئی تھیں، چنانچہ جامع بیان العلم میں ان میں سے بعض احادیث منقول بھی ہیں۔ (۳)

یہ تو معدودے چند تحریروں اور بعض نوشتوں کا ذکر تھا لیکن ان کے علاوہ مختلف قبائل کو تحریری ہدایات، خطوط کے جوابات، مدینہ منورہ کی مردم شماری کے کاغذات، سلاطین وقت اور مشہور فرمانرواؤں کے نام اسلام کے دعوت نامے، عمال اور ولایت کے نام احکام، معاہدات، صلحنامے، امان نامے اور اسی قسم کی بہت سی مختلف تحریرات تھیں، جو آنحضرت ﷺ نے وقتاً فوقتاً قلمبند کروائیں، محدثین نے آپ

(۱) سنن ابی داؤد (۲) امام نسائی نے اس حدیث کو کتاب الفراء والغیرہ میں (زیر عنوان ”ما یبلغ فی جلود المیتہ“) نقل کیا ہے اور بقیہ حضرات نے کتاب الملباس میں، ملاحظہ ہو سنن ابی داؤد، باب من روی ان لا یتستفح باب المیتہ، جامع ترمذی، باب ما جاء فی جلود المیتہ از دہغت، سنن ابن ماجہ، باب من کان لا یتفق من المیتہ باب ولا نعصب۔

(۳) جامع بیان العلم، باب الرخصة فی کتاب العلم۔

ﷺ کے نامے اور معاہدات و وثائق کو مستقل تصانیف میں علیحدہ جمع کیا ہے، چنانچہ اسی موضوع پر حافظ شمس الدین محمد بن علی بن احمد بن طولون دمشق حنفی متونی ۹۵۳ھ کی مشہور تصنیف ”أعلام السائلین عن كتب سيد المرسلين“ چند سال ہوئے طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔

عہد رسالت میں صحابہ کے بعض نوشتے

سابق میں سنن ابی داؤد اور سنن دارمی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی یہ تصریح گزر چکی ہے کہ ”میں آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کرنے کے ارادہ سے قلمبند کر لیا کرتا تھا۔“ اسی حدیث میں یہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ یہ سب کچھ آنحضرت ﷺ کی اجازت اور آپ ﷺ کے حکم سے تھا، صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ آنحضرت ﷺ سے حدیثیں روایت کرنے والا کوئی نہیں، مگر ہاں عبداللہ بن عمرو ہو سکتے ہیں، کیونکہ وہ حدیثیں لکھا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا، (۱) امام احمد نے اپنی مسند میں اور بیہقی نے مدخل میں مجاہد اور مغیرہ بن حکیم سے نقل کیا ہے کہ ہم دونوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یہ فرماتے سنا تھا کہ مجھ سے زیادہ حدیث رسول اللہ ﷺ کا کوئی عالم نہیں، مگر عبداللہ بن عمرو (رضی اللہ عنہما) کا معاملہ متشکی ہے کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے

(۱) صحیح بخاری ”باب کتابة العلم“، جامع ترمذی ”باب ما جاء في الرخصة فيه“۔

لکھتے اور دل سے یاد رکھتے تھے اور میں صرف یاد رکھتا تھا، لکھتا نہ تھا، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے لکھنے کی اجازت مانگی تھی اور آپ ﷺ نے ان کو اجازت دیدی تھی۔ (۱)

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے حدیث نبوی کی کتابت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب تیار ہو گئی تھی جس کا نام انہوں نے ”صادقہ“ رکھا تھا، یہ کتاب انہیں اس قدر عزیز تھی کہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

ما یرغبني في الحياة إلا الصادقة والوهط

”مجھے زندگی کی یہی دو چیزیں خواہش دلاتی ہیں، صادقہ اور وھط“۔

پھر خود ہی ان دونوں چیزوں کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

فأما الصادقة فصحيحة كتبها من رسول الله ﷺ وأما الوهط

فأرض تصدق بها عمرو بن العاص كان يقوم عليها. (۲)

”صادقہ وہ صحیفہ ہے جس کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر

لکھا ہے اور وھط وہ زمین ہے جس کو (والد بزرگوار) حضرت

عمرو بن العاصؓ نے راہ خدا میں وقف کیا تھا اور وہ اس کی

دیکھ بھال رکھا کرتے تھے۔“

یہ صحیفہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی وفات پر ان کے پوتے شعیب بن محمد

بن عبداللہ کو ملا تھا (۳) اور شعیبؓ سے اس نسخہ کو ان کے صاحبزادے عمرو روایت

(۱) فتح الباری، ”باب کتابۃ العلم“۔ (۲) سنن دارمی ”باب من رخص فی کتابۃ العلم“، جامع بیان العلم ”باب

ذکر الرخصة فی کتاب العلم“۔ (۳) تہذیب المعجم، ترجمہ عمرو بن شعیب۔

کرتے ہیں۔ (۱) چنانچہ حدیث کی کتابوں میں ”عمرو بن شعیب عن أبیه عن جدّه“ کے سلسلہ سے جتنی روایتیں منقول ہیں، وہ سب صحیفہ ”صادقہ“ ہی کی حدیثیں ہیں، سابق میں بعض حفاظ حدیث کی تصریح آپ پڑھ چکے ہیں کہ یہ نسخہ متواتر ہے، شعیب کے والد محمد کا انتقال اپنے باپ کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، اس لئے پوتے کی تمام تر تربیت دادا ہی کے ظل عاطفت میں ہوئی تھی، البتہ محدثین کا اس میں اختلاف ہے کہ شعیب نے صادقہ کا نسخہ دادا سے پڑھا تھا یا نہیں، بعض سخت گیر محدثین نے اسی بنا پر ان روایات کے اتصال پر بھی کلام کیا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی ”تہذیب التہذیب“ میں عمرو بن شعیب کے ترجمہ میں تکی بن معین سے ناقل ہیں کہ

هو ثقة في نفسه، وماروى عن أبیه عن جدّه لا حجة فيه، وليس بمتصل، وهو ضعيف من قبيل أنه مرسل، وجد شعیب كتب عبد الله بن عمرو فكان يرويه عن جدّه إرسالا وهي صحاح عن عبد الله بن عمرو غير أنه لم يسمعها.

”یہ خود تو ثقہ ہیں اور جو روایت یہ اپنے باپ شعیب سے اور وہ

اپنے دادا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں وہ حجت نہیں، غیر

متصل ہے اور بسبب مرسل ہونے کے ضعیف ہے، شعیب کو

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی کتابیں ملی تھیں چنانچہ وہ ان کو اپنے دادا

(۱) جامع ترمذی ”باب ما جاء في كراهية البيع والشراء وانشاء الفضلة والشرع في المسجد“ اور ”باب ما جاء في زكاة مال اليتيم“

سے مرسل روایت کرتے ہیں، یہ روایتیں اگرچہ عبداللہ بن عمرو
 ﷺ سے صحیح ہیں، لیکن ان کو شعیب نے سنا نہیں تھا۔“
 حافظ ابن حجر اس عبارت کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

قلت فإذا شهد له ابن معين أن أحاديثه صحاح غير أنه لم
 يسمعها وصح سماعه لبعضها فغاية الباقي أن يكون وجادة
 صحيحة وهو أحد وجوه التحمل.

”میں کہتا ہوں جب کہ ابن معین اس امر کی شہادت دے رہے
 ہیں کہ اس کی حدیثیں تو صحیح ہیں مگر ان کو شعیب نے سنا نہیں ہے
 اور بعض حدیثوں کا سماع صحت کو پہنچ چکا ہے (۱) تو بقیہ احادیث
 کی روایت زیادہ سے زیادہ ”وجادہ صحیحہ“ (۲) سے ہو
 گی اور یہ بھی اخذ علم کا ایک طریقہ ہے۔“
 اور امام ترمذی اپنی جامع میں فرماتے ہیں:

ومن تكلم في حديث عمرو بن شعيب إنما ضعفه لأنه
 يحدث عن صحيفة جده كأنهم رأوا أنه لم يسمع هذه

(۱) چنانچہ یہ روایتیں سنن ابی داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں موجود ہیں اور حافظ ابن حجر نے
 تہذیب التہذیب میں ان کا ذکر کیا ہے اور بہت سے ائمہ حدیث سے شعیب کے متعلق داؤد سے سماع کی تصریح بھی
 نقل کی ہے۔ (۲) ”وجادہ“ وجد مجذ کا مصدر ہے جس کے معنی پانے کے ہیں یہ مصدر پہلے مستعمل نہ تھا
 محدثین نے اس کو استعمال کرنا شروع کیا، ان کی اصطلاح میں کسی کتاب یا نوشتہ میں مصنف یا اصل راوی کی تحریر
 پا کر خود اس سے سننے بغیر اس کی حدیثوں کو روایت کرنا ”وجادہ“ کہلاتا ہے۔

الأحادیث من جدہ. (۱)

”اور جس نے بھی عمرو بن شعیب کی حدیث میں کلام کیا ہے سو محض اس بنا پر اس کی تضعیف کی ہے کہ وہ اپنے دادا کے صحیفہ سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے، گویا ان لوگوں کی یہ رائے ہے کہ انھوں نے ان حدیثوں کو اپنے دادا سے نہیں سنا تھا۔“

لیکن اکثر محدثین عمرو بن شعیب کی ان حدیثوں کو حجت مانتے اور صحیح سمجھتے ہیں، چنانچہ امام ترمذی اسی عبارت سے ذرا پہلے امام بخاری سے نقل ہیں کہ رأیت أحمد وإسحاق و ذکر غیرهما یحتجون بحديث عمرو بن شعيب.

”میں نے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، اور ان دونوں کے علاوہ اور محدثین کا ذکر کیا کہ ان سب کو دیکھا کہ وہ عمرو بن شعیب کی حدیث کو حجت مانتے تھے۔“

اور ”باب ماجاء فی زکوة مال الیتیم“ میں لکھتے ہیں:

وأما أكثر أهل الحديث فيحتجون بحديث عمرو بن شعيب ويثبتونه.

”اور اکثر محدثین عمرو بن شعیب کی حدیث کو حجت سمجھتے اور ثابت مانتے ہیں۔“
امام بخاری اور امام ترمذی نے اس کی بھی تصریح کی ہے کہ شعیب نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے حدیثیں سنی ہیں، (۲) شعیب کو تو یہ پورا نسخہ وراثت (۱) باب ماجاء فی کرہیۃ النج والشرء والشاء والفضالۃ والشر فی المسجد. (۲) جامع ترمذی کے دونوں ابواب ملاحظہ ہوں۔

میں ملا ہی تھا، لیکن حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ان کے دوسرے تلامذہ نے جتنی حدیثیں روایت کی ہیں وہ بھی اسی صحیفہ صادقہ کی ہیں۔

(۲) عہد رسالت کے تحریری نوشتوں میں سے ایک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا صحیفہ بھی تھا، جس کے متعلق خود ان کا بیان ہے کہ

ماکتبنا عن النبی ﷺ إلا القرآن وما فی هذه الصحیفه (۱)

”ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بجز قرآن کے اور جو کچھ اس

صحیفہ میں درج ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھا۔“

یہ صحیفہ چمڑے کے ایک تھیلہ میں تھا، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلواریں نیاں رکھی رہتی تھیں، (۲) یہ وہی صحیفہ ہے جس کے متعلق صحیح بخاری میں آپ کے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ سے مذکور ہے کہ

أرسلني أبي، خذ هذا الكتاب فاذهب به إلى عثمان فإن فيه أمر

النبي ﷺ في الصدقة. (۳)

”مجھ کو میرے والد نے بھیجا کہ اس کتاب کو لے کر حضرت عثمان

رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ کیونکہ اس میں زکوٰۃ کے متعلق آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام درج ہیں۔“

اس صحیفہ میں زکوٰۃ کے علاوہ خون بہا، اسیروں کی رہائی، کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہ کرنا، حرم مدینہ کے حدود اور اس کی حرمت، غیر کی طرف انتساب کی

(۱) صحیح بخاری ”باب اثم من عاهد ثم عذر۔“ (۲) صحیح مسلم ”باب تحريم الذن لغير الله۔“

(۳) صحیح بخاری ”باب ما ذكر من ورع النبي ﷺ ومن شعره و آية ما شرک فيه اصحابه غیر ہم بعد وفاته ﷺ۔“

ممانعت، نقض عہد کی برائی، غیر کے لئے ذبح کرنے پر وعید اور زمین کے نشانات مٹانے کی مذمت وغیرہ بہت سے احکام و مسائل درج تھے، حدیث کی اکثر کتابوں میں اس صحیفہ کی روایتیں موجود ہیں، خود امام بخاری نے بھی حسب ذیل ابواب میں اس صحیفہ کی مذکورہ بالا روایات کو نقل کیا ہے (۱) بابۃ کتاب العلم (۲) باب حرم المدینۃ (۳) باب فکاک الأسیر (۴) باب ذمۃ المسلمین وجوارہم واحدة یسعی بہا أدناہم (۵) باب إثم من عاہد ثم غدر (۶) باب إثم من تبرأ من موالیہ (۷) باب العاقلة (۸) باب لا یقتل المسلم بالکافر (۹) باب ما یکرہ من التعمق والتنازع فی العلم والغلو فی الدین۔

صحیح بخاری میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ منبر پر خطبہ دیا تو آپ کی نگوار کے ساتھ یہ صحیفہ آویزاں تھا، پھر آپ نے فرمایا کہ بخدا ہمارے پاس بجز کتاب اللہ کے اور جو کچھ اس صحیفے میں مرقوم ہے، اس کے علاوہ کوئی نوشتہ نہیں کہ جو پڑھا جاسکے، اس کے بعد آپ نے اس صحیفہ کو کھولا اور لوگوں کو اس کے مسائل پر اطلاع ہوئی۔ (۱)

(۳) حضرت رافع بن خدیجؓ کے متعلق سابق میں گزر چکا ہے کہ وہ عہد رسالت میں بھی حدیثیں لکھا کرتے تھے جس کی اجازت ان کو خود آنحضرت ﷺ نے دی تھی، چنانچہ ان کے پاس بھی آنحضرت ﷺ کی بہت سی حدیثیں تحریری شکل میں موجود تھیں، مسند امام احمد بن حنبل میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ مروان نے خطبہ دیا، جس میں مکہ معظمہ اور اس کے حرمت کا ذکر تھا، تو حضرت رافع بن خدیجؓ نے پکار کر کہا ”اگر مکہ حرم ہے، تو مدینہ بھی حرم ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے حرم قرار دیا ہے

(۱) صحیح بخاری ”کتاب الاعتصام“ باب ما یکرہ من التعمق والتنازع فی العلم والغلو فی الدین۔

اور یہ حکم ہمارے پاس چڑے پر لکھا ہوا ہے، اگر تم چاہو تو تمہیں پڑھ کر سنادیں“
مردان نے جواب دیا ہاں! ہمیں بھی آپ ﷺ کا یہ حکم پہنچا ہے۔ (۱)
صحابہ کرام کے بعض اور نوشتے

(۱) صحیح بخاری، سنن ابی داؤد (باب فی زکوۃ السائمه) سنن نسائی
(باب زکوۃ الإبل) میں مذکور ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے جب حضرت انس
ؓ کو بحرین پر عامل بنا کر روانہ کیا تو زکوۃ کے مسائل واحکام کے متعلق ایک مفصل
تحریر لکھ کر ان کے حوالہ کی، جو ان لفظوں سے شروع ہوتی ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، هذه فريضة الصدقة التي فرض
رسول اللہ ﷺ على المسلمين و التي أمر اللہ بهارسوله الخ
(صحیح بخاری ”باب زکوۃ الغنم“)

امام بخاری نے اس نوشتہ کی روایات کو ”کتاب الزکوۃ“ کے تین مختلف
ابواب میں متفرق طور پر درج کیا ہے، اور اپنی صحیح میں گیارہ جگہ اس کو روایت کیا ہے،
چھ جگہ ”کتاب الزکوۃ“ میں، دو جگہ ”کتاب اللباس“ میں اور ایک ایک جگہ
”کتاب الشرکۃ“ ”ابواب الخمس“ اور ”کتاب الحیل“ میں، یہ نوشتہ
حضرت انس ؓ کے خاندان میں برابر محفوظ چلا آتا تھا، چنانچہ امام بخاری نے اس کو
محمد بن عبد اللہ بن المثنیٰ بن عبد اللہ بن انس سے جو حضرت انس ؓ کے پوتے کے
پوتے ہیں، روایت کیا ہے، محمد اس کو اپنے والد عبد اللہ سے اور عبد اللہ اپنے چچا ثامہ بن

عبداللہ بن انسؓ اور وہ خود حضرت انسؓ سے اس کے راوی ہیں، اور امام ابوداؤد اس کو حدیث کے مشہور راوی حماد بن سلمہ سے روایت کرتے ہیں، جن میں حماد کی تصریح بھی موجود ہے کہ ”میں نے خود ثمامہ سے اس نوشتہ کو اخذ کیا ہے“ اس پر آنحضرت ﷺ کی مہر مبارک بھی ثبت تھی۔

(۲) جامع ترمذی میں سلیمان تمیمی سے منقول ہے کہ حسن بصری اور قتادہ، حضرت جابر بن عبداللہؓ کے صحیفہ سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے، (۱) حضرت جابرؓ کے اس صحیفہ کا ذکر بہت سے محدثین کے تذکرہ میں آیا ہے، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں قتادہ کے ترجمہ میں امام احمد سے نقل کیا ہے کہ

كان قتاده أحفظ أهل البصرة لا يسمع شيئاً إلا حفظه قرأت عليه صحيفة جابر مرة فحفظها.

”قتادہ اہل بصرہ میں سب سے بڑے حافظ تھے جو سنتے یاد ہو جاتا، حضرت جابرؓ کا صحیفہ صرف ایک بار ان کے سامنے پڑھا گیا تھا، بس انہیں یاد ہو گیا۔“

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں اسمعیل بن عبدالکریم صنعانی المتوفی ۲۱۰ھ کے ترجمہ میں بھی اس صحیفہ کا ذکر کیا ہے کہ یہ اس کو وہب بن منبہ سے اور وہ اس کو حضرت جابرؓ سے روایت کرتے تھے اور سلیمان بن قیس یشکری کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ

قال أبو حاتم جالس جابراً وكتب عنه صحيفة و توفي، وروى

(۱) جامع ترمذی ”باب ما جاء في أرض المشرق يريد بعضهم بيع نصيب“

أبو الزبير وأبو سفيان والشعبي عن جابر وهم قد سمعوا من جابر وأكثره من الصحيفة وكذلك قتادة.

”ابو حاتم کا بیان ہے کہ سلیمان نے حضرت جابر ؓ کی ہم نشینی اختیار کی اور ان سے صحیفہ لکھا اور وفات پا گئے اور ابو الزبیر، ابو سفیان اور شعبی نے بھی حضرت جابر ؓ سے روایتیں کی ہیں اور ان لوگوں نے حضرت جابر ؓ سے حدیثیں بھی سنی ہیں جو اکثر اسی صحیفہ کی ہیں اور اسی طرح قتادہ نے بھی۔“

اور طلحہ بن نافع ابو سفیان واسطی کے ترجمہ میں سفیان بن عیینہ اور شعبہ دونوں کا متفقہ بیان نقل کیا ہے کہ

حدیث أبي سفيان عن جابر إنما هي صحيفة.

”ابو سفیان، جابر سے جو حدیث روایت کرتے ہیں وہ صحیفہ سے ہوتی ہے۔“

(۳) حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں امام حسن بصریؒ کے ترجمہ

میں لکھا ہے کہ انھوں نے حضرت سمرۃ بن جندب ؓ سے حدیث کا ایک بہت بڑا نسخہ روایت کیا ہے، جس کی بیشتر حدیثیں سنن اربعہ میں منقول ہیں، علی بن المدینی اور امام بخاری دونوں نے تصریح کی ہے کہ اس نسخہ کی سب حدیثیں ان کی مسموعہ تھیں، لیکن یحییٰ ابن سعید القطان اور دیگر علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ سب نوشتہ سے روایت ہیں، اس نسخہ کو امام حسن بصریؒ کے علاوہ خود حضرت سمرۃ بن جندب ؓ کے صاحبزادے سلیمان بن سمرۃ بھی ان سے روایت کرتے ہیں، چنانچہ تہذیب التہذیب میں سلیمان کے ترجمہ میں مذکور ہے ”روی عن أبيه نسخة كبيرة.“

(۴) حضرت ابو ہریرہ ؓ اگرچہ عہد رسالت میں حدیثیں لکھتے نہ تھے، لیکن بعد کوانھوں نے بھی اپنی تمام مرویات کو تحریری شکل میں محفوظ کر لیا تھا، چنانچہ ابن وہب نے حسن بن عمرو بن امیہ ضمری کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے ایک حدیث بیان کی، تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے گھر پر لے گئے اور حدیث نبوی کی کتابیں دکھلا کر کہنے لگے ”دیکھو یہ حدیث میرے پاس بھی لکھی ہوئی ہے۔“ (۱)

(۵) امام ترمذی نے اپنی جامع میں کتاب العلل کے اندر عکرمہ سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ طائف کے کچھ لوگ حضرت ابن عباس ؓ کی خدمت میں ان کی کتابوں میں سے ایک کتاب لے کر آئے، حضرت عبداللہ بن عباس ؓ نے اس کتاب کو لے کر پڑھنا شروع کیا، مگر الفاظ میں تقدیم و تاخیر ہونے لگی، تو آپ نے ان سے فرمایا کہ ”میں تو اس مصیبت (ضعف بصر) کے سبب عاجز ہو چکا ہوں تم خود اس کو میرے سامنے پڑھو کیونکہ (جواز روایت میں) تمہارا میرے سامنے پڑھ کر سنانا اور میرا قرار کر لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ میرا خود تمہارے سامنے پڑھنا۔“

(۶) حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے نبیرہ معن بن عبدالرحمن کی زبانی نقل کیا ہے کہ

أخرج إليّ عبدالرحمن بن عبد الله بن مسعود كتاباً وحلف لي أنه من خط أبيه بيده. (۲)

(۱) فتح الباری، ”باب کتاب العلم“۔ (۲) جامع بیان العلم ”باب ذکر الرخصة فی کتاب العلم“ یہ روایت سنن دارمی میں بھی ”باب سنن ہاب المتفقوا کرہ التلخیص والعبدع“ میں مذکور ہے۔

”(والد محترم) عبدالرحمن بن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک کتاب میرے سامنے نکال کر لائے اور قسم کھا کر مجھ سے کہنے لگے کہ یہ ابا جان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔“

ہم نے صحابہ کے صرف ان چند مشہور نوشتوں کے ذکر پر اکتفا کی ہے کہ جو بہت سی احادیث پر مشتمل تھے یا جو مستقل صحیفہ اور کتاب کی حیثیت رکھتے تھے، ورنہ اگر صحابہ کی ان تمام تحریرات کو یکجا جمع کیا جائے کہ جس میں انھوں نے کسی حدیث کا ذکر کیا ہے، تو اس کے لئے ایک مستقل کتاب چاہئے، جس کے لئے کافی فرصت اور وسیع مطالعہ اور تتبع و تلاش کی ضرورت ہے۔

عہد صحابہ میں تابعین کے نوشتے

(۱) سنن دارمی میں بشیر بن نہیک سدوسی سے جو مشہور تابعی ہیں منقول ہے کہ

كنت أكتب ما أسمع من أبي هريرة فليما أردت أن أفارقه أتيت به بكتابه فقرأته عليه وقلت له هذا ما سمعت منك قال نعم.

(باب من رخص في كتابة العلم)

”میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو حدیثیں سنتا، لکھ لیتا تھا، پھر

جب میں نے ان سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا تو اس کتاب کو لیکر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کو ان کے سامنے پڑھ کر سنایا اور پھر ان سے عرض کیا کہ یہ سب وہی حدیثیں ہیں جو

میں نے آپ سے سنی ہیں؟ فرمانے لگے ہاں!

امام ترمذی نے بھی کتاب العلل میں اس واقعہ کو بالا اختصار نقل کیا ہے۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات سے ایک صحیفہ ہمام بن منبہ یمانی نے بھی مرتب کیا تھا، اس میں ایک سو چالیس کے قریب احادیث مذکور ہیں، (۱) یہ پورا صحیفہ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں یکجا روایت کیا ہے، (۲) صحیحین میں بھی اس صحیفہ کی روایتیں متفرق طور پر موجود ہیں، حافظ ابن حجر نے اس صحیفہ کے متعلق ابن خزیمہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ”صحیفۃ ہمام عن ابی ہریرۃ مشہورۃ“ (۳) یہ صحیفہ آج بھی برلن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۳) سنن دارمی (باب ممن رخص فی کتابۃ العلم) میں سعید بن جبیر سے جو مشہور ائمہ تابعین میں سے ہیں مروی ہے کہ

كنت أكتب عند ابن عباس في صحيفة .

”میں ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کے پاس بیٹھا ہوا صحیفہ میں لکھتا رہتا تھا۔

دارمی ہی نے ان سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ میں رات کو مکہ معظمہ کی راہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہمرکاب ہوتا وہ مجھ سے کوئی حدیث بیان کرتے تو پالان کی لکڑی پر لکھ لیتا تا کہ صبح کو پھر اسے نقل کر سکوں، سنن دارمی ہی میں ان کا یہ بیان بھی مذکور ہے کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے رات کو حدیث سنتا تو پالان کی لکڑی پر لکھ لیتا تھا۔

(۱) تہذیب التہذیب، ترجمہ ”ہمام بن منبہ“۔

(۲) مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۲ لغایت ۳۱۸ طبع مہدیہ مصر ۱۳۱۳ھ۔

(۳) تہذیب التہذیب، ترجمہ اسماعیل بن عبدالکریم صنعانی۔

(۴) سنن دارمی میں مسلم بن قیس کا بیان مذکور ہے کہ میں نے ابان کو دیکھا کہ

وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تختیوں پر لکھتے رہتے تھے۔ (باب مذکور)

(۵) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک زمانے تک کتابت حدیث کے قائل نہ

تھے، مروان نے اپنی امارت مدینہ کے زمانہ میں ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کچھ

حدیثیں لکھ دیں، مگر آپ نے منظور نہ فرمایا، آخر اس نے یہ تدبیر نکالی کہ پردہ کے پیچھے

کاتب بیٹھایا اور خود حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اپنے یہاں بلانے لگا، یہاں مختلف لوگ آپ

سے مسائل و احکام دریافت کرتے اور آپ جو کچھ فرماتے کاتب لکھتا جاتا۔ (۱)

حفظ حدیث

یہ معدودے چند وہ واقعات ہیں، جن میں خود صحابہ یا صحابہ کے سامنے

حدیث کے صحیفے اور نوشتے لکھے جانے کا ذکر ہے، دور تا بعین میں اگرچہ احادیث

کے قلمبند کرنے کا سلسلہ پہلے سے بہت زیادہ ہو گیا تھا، تاہم اب تک عام طور پر لوگ

لکھنے کے عادی نہ تھے اور جو کچھ لکھتے تھے، اس سے مقصود صرف اس کو ازبر کرنا ہوتا

تھا، اس زمانہ میں حدیثوں کو سن کر انہیں زبانی یاد کرنے کا اسی طرح رواج تھا، جس

طرح مسلمان قرآن پاک کو یاد کرتے ہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لم یکن القوم یکتبون إنما کانوا یحفظون، فمن کتب منهم الشی

فإنما یکتبه لیحفظه فإذا حفظه محاه (۲)

”اگلے لوگ لکھتے نہ تھے، بس حفظ کرتے تھے اور جو کوئی ان میں

(۱) سنن دارمی، باب من لم یرکتبہ اللہ یرثہ (۲) جامع بیان العلم، باب ذکر کراہیۃ کتبہ العلم و تخلیدہ فی المصحف۔

سے کچھ لکھ بھی لیتا، تو حفظ کرنے ہی کے لئے لکھتا اور جب حفظ کر لیتا، تو اسے مٹا ڈالتا۔“

تقریباً پہلی صدی ہجری تک عرب علماء عام طور پر کتابت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عربوں کا حافظہ فطرۃ نہایت قوی تھا، وہ جو کچھ سنتے فوراً یاد کر لیتے تھے، ایسی صورت میں کسی چیز کو لکھنا تو درکنار اس کا دوبارہ پوچھنا بھی نظر استعجاب سے دیکھا جاتا تھا، چنانچہ سنن دارمی میں، ابن شہر مہ کی زبانی منقول ہے کہ شعی کہا کرتے تھے، اے شباک (شعی کے شاگرد کا نام) میں تم سے دوبارہ حدیث بیان کر رہا ہوں، حالانکہ میں نے کبھی کسی سے حدیث کے دوبارہ اعادہ کی درخواست نہیں کی، اسی کتاب میں شعی کا یہ بیان بھی موجود ہے کہ

ما کتبت سواداً فی بیاض ولا استعدت حدیثاً من انسان.

”میں نے نہ کبھی سپیدی پر سیاہی سے لکھا اور نہ کبھی کسی انسان

سے ایک مرتبہ حدیث سن کر دوبارہ اس سے اعادہ کروایا“

سنن دارمی ہی میں امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ امام زہری نے ایک بار ایک حدیث بیان کی، پھر کسی راستہ میں میری اور زہری کی ملاقات ہوئی تو میں نے ان کی لگام تھام کر عرض کیا کہ اے ابو بکر (یہ امام زہری کی کنیت ہے) جو حدیث آپ نے ہم سے بیان کی تھی، اسے ذرا مجھے دوبارہ بتا دیجئے، جواب دیا تم حدیث کو دوبارہ پوچھتے ہو، میں نے کہا! کیا آپ دوبارہ نہیں پوچھتے تھے، کہنے لگے، نہیں، میں نے کہا، لکھتے بھی نہ تھے، کہنے لگے، نہیں۔ (۱)

حافظ ابن عبد البر، جامع بیان العلم میں ان تمام علماء کے اقوال نقل کرنے کے بعد کہ جو کتابت علم کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے، فرماتے ہیں۔

من ذكرنا قوله في هذا الباب، فإنما ذهب في ذلك مذهب العرب، لأنهم كانوا مطبوعين على الحفظ، مخصوصين بذلك، والذين كرهوا الكتاب كابن عباس والشعبي وابن شهاب والسخي وقتادة، ومن ذهب مذهبه، وجبل جبلتهم، كانوا قد طبعوا على الحفظ، فكان أحدهم يجتزئ بالسمعة، ألا ترى ما جاء عن ابن شهاب أنه كان يقول إني لأمرُّ بالبيع فأسدُّ أذاني مخافة أن يدخل فيها شيء من الخنا، فوالله ما دخل أذني شيء قط فنسيت، وجاء عن الشعبي نحوه، وهؤلاء كلهم عرب، وقال النبي ﷺ ”نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب“ وهذا مشهور أن العرب قد خصَّت بالحفظ، كان أحدهم يحفظ أشعار بعض في سمعة واحدة، وقد جاء أن ابن عباس حفظ قصيدة عمر بن أبي ربيعة ع

أمن ال نعم أنت غاد فمبكر

في سمعة واحدة على ما ذكروا، وليس أحد اليوم على هذا ولولا الكتاب لضاع كثير من العلم، وقد رخص رسول الله ﷺ في كتاب العلم، ورخص فيه جماعة من العلماء وحمدوا ذلك. (۱)

(۱) جامع بیان العلم، باب کراهیۃ کتابۃ العلم و تحفیدہ فی الصحف۔

”جس کا قول بھی ہم نے اس باب میں ذکر کیا ہے، وہ اس بارے میں عرب ہی کی روش پر گیا ہے، کیونکہ وہ فطری طور پر قوت حافظہ رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں ممتاز تھے، اور جن حضرات نے بھی کتابت کو ناپسند فرمایا ہے، جیسے حضرت ابن عباسؓ، امام شعی، امام ابن شہاب زہری، امام ابراہیم نخعی اور قتادہ اور وہ حضرات کہ جو ان ہی کے طریقے پر چلے اور ان ہی کی فطرت پر پیدا ہوئے، یہ سب کے سب وہ ہیں، جو طبعی طور پر قوت حافظہ رکھتے تھے، چنانچہ ان میں کا ایک ایک شخص صرف ایک بار کے سن لینے پر اکتفا کیا کرتا تھا، دیکھتے نہیں کہ ابن شہاب سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے، میں جب بیچ سے گذرتا ہوں تو اپنے کان اس ڈر سے بند کر لیتا ہوں کہ کہیں کوئی فحش بات اس میں نہ پڑ جائے، کیونکہ خدا کی قسم کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بات میرے کان میں پڑی اور میں اس کو بھول گیا ہوں“ اور شعی سے بھی اسی قسم کا بیان منقول ہے، یہ سب لوگ عرب تھے، اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”ہم امی لوگ ہیں، نہ لکھنا جانیں نہ حساب کرنا“ اور یہ چیز تو مشہور ہے کہ عرب کو زبانی یاد رکھنے میں خصوصیت حاصل ہے، چنانچہ ان میں کا ایک ایک شخص بعض لوگوں کے اشعار کو ایک دفعہ کے سننے میں حفظ کر لیا کرتا تھا، حضرت ابن عباسؓ کے متعلق آتا ہے کہ انھوں

نے عمر بن ابی ربیعہ کے قصیدے ع امن ال نعم أنت غاد فمبکر (۱) کو صرف ایک دفعہ سن کر یاد کر لیا تھا، چنانچہ علماء نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور آج کوئی ایک شخص بھی اس طرح کی قوت حافظہ نہیں رکھتا، بلکہ اگر تحریر نہ ہو تو علم کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے، حالانکہ آنحضرت ﷺ بھی کتابت علم کی اجازت مرحمت فرما چکے ہیں اور علماء کی ایک جماعت نے بھی اس کی رخصت دی ہے اور اس کو فعل محمود قرار دیا ہے۔“

اور یہ ان علماء ہی کی برکت ہے کہ جس کی بدولت ہم کو ایک ہزار سال تک ہر دور میں حدیث شریف کے حافظ بکثرت نظر آتے ہیں اور قرآن کریم کے حفاظ تو الحمد للہ آج بھی اسلامی دنیا کے چپہ چپہ پر پھیلے ہوئے ہیں، پچھلی چند صدیوں میں اگرچہ حفظ حدیث کا سلسلہ بہت ہی کم ہو گیا، تاہم مطابع کے وجود میں آنے سے پہلے پہلے علماء اسلام کا یہ عام دستور تھا کہ وہ ہر فن میں ایک مختصر متن طالب علم کو حفظ یاد کرادیا کرتے تھے، موجودہ صدی کو چھوڑ کر کسی صدی کے علماء کا تذکرہ اٹھا لیجئے اور ان کے حالات پڑھئے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ مختلف علوم و فنون کی کتنی کتابیں زبانی یاد کیا کرتے تھے۔

حفاظ حدیث کے تذکرے

علماء محدثین نے حفاظ حدیث کے حالات پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن

(۱) دوسرا مصرع ہے ع غداة غدام رائح فمبجو، یہ پورا قصیدہ بحر طویل میں ہے اور ستر اشعار کے قریب قریب ہے۔

میں صرف ان لوگوں کا تذکرہ ہے، جو اپنے وقت میں حافظ حدیث کہلاتے تھے، ہمیں اب تک اس موضوع پر جن کتابوں کا پتہ چل سکا ہے، حسب ذیل ہیں۔

(۱) أسماء الحفاظ از حافظ ابوالولید یوسف بن عبدالعزیز الاندلسی محدث مرسیۃ المشہور بابن الذبّاغ المتوفی ۵۳۶ھ، حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں ان کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ ”ولہ جزء لطیف فی أسماء الحفاظ“ اس کتاب میں حفاظ کا سلسلہ امام زہری سے شروع ہو کر حافظ ابوطاہر سلفی پر ختم ہوتا ہے۔

(۲) أخبار الحفاظ از علامہ ابن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ طاہریہ دمشق میں موجود ہے، اس کتاب میں سو کے قریب ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو حفظ کے اعتبار سے اپنے وقت میں یکتا شمار کئے جاتے تھے، لیکن یہ صرف حفاظ حدیث ہی کا تذکرہ نہیں بلکہ بعض دوسرے علوم و فنون کے حفاظ بھی اس میں آگئے ہیں۔

(۳) کتاب أربعین الطبقات از حافظ شرف الدین ابوالحسن علی بن المفصل المتوفی ۷۱۱ھ صاحب کشف الظنون نے ”طبقات الحفاظ“ کے سلسلہ میں ابن المفصل کی جس تصنیف کا ذکر کیا ہے، وہ یہی ہے، یہ حفاظ حدیث کے حالات میں نہایت جامع اور مفصل کتاب ہے، جو چالیس طبقات پر مرتب ہے، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جا بجا اس کتاب کے حوالے دیئے ہیں۔ (۱)

(۱) تذکرۃ الحفاظ میں حمزہ بن محمد کنانی المتوفی ۳۵۷ھ، ابن مندہ المتوفی ۳۹۵ھ اور ابو نعیم اصفہانی المتوفی ۴۳۰ھ کے تراجم ملاحظہ ہوں۔

(۴) طبقات الحفاظ از شیخ الاسلام تقی الدین بن دیق العید المتوفی ۷۰۲ھ، حافظ سخاوی نے الإعلان بالتوبیخ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے، یہ صرف حفاظ حدیث کا تذکرہ ہے اور اس میں صرف ان ہی لوگوں کو لیا ہے کہ جب اسانید میں ان کا نام آتا ہے، تو حفاظ کے لقب کے ساتھ آتا ہے۔

(۵) تذکرة الحفاظ از حافظ ٹس الدین ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے اور دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے مکرر طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، یہ صحابہ سے لیکر اپنے دور تک کے حفاظ حدیث کا تذکرہ ہے، دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

”یہ حاملان علم نبوی کی عدالت بیان کرنے والوں کا تذکرہ

ہے، جن کے اجتہاد پر توثیق و تضعیف اور ترجیح اور تزییف (۱)

میں رجوع کیا جاتا ہے۔“

حافظ موصوف نے تمام کتاب میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے اور کسی ایسے شخص کا ترجمہ نہیں لکھا کہ جو حدیث کا حافظ نہ شمار کیا جاتا ہو، چنانچہ علامہ ابن قتیبہ کے متعلق جو لغت و عربیت کے مشہور امام ہیں اور علم حدیث میں بھی ان کی بعض تصانیف موجود ہیں، یہ لکھتے ہیں:

ابن قتیبہ من أوعية العلم لكنه قليل العمل بالحدیث فلم أذكره.

”ابن قتیبہ علم کا مخزن ہیں لیکن حدیث میں ان کا کام تھوڑا ہے

اس لئے میں نے ان کو ذکر نہیں کیا۔“

اور خاجہ بن زید بن ثابت اگرچہ فقہاء سبعہ میں شمار کئے جاتے ہیں، لیکن ان کے متعلق بھی صاف تصریح کر دی ہے کہ ”چونکہ وہ قلیل الحدیث تھے اس لئے میں نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار نہیں کیا۔“

اسی طرح ان لوگوں کا تذکرہ بھی اس کتاب میں نہیں لکھا ہے کہ جو اگرچہ حدیث کے حافظ تھے، مگر محدثین کے نزدیک متروک الروایہ خیال کئے جاتے تھے، چنانچہ ہشام بن محمد کلبی کے متعلق کہ جو بہت بڑا اخباری اور علامہ تھا لکھتے ہیں:

هشام بن كلبى الحافظ أحد المتروكين ليس بثقة فلهذا لم أدخله بين حفاظ الحديث.

”ہشام بن الکلبی حافظ حدیث متروک ہے ثقہ نہیں اسی لئے میں نے اس کو حفاظ حدیث میں داخل نہیں کیا۔“

اس کلبی کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ تین دن میں پورا قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ اور اقدی کے بارے میں لکھتے ہیں:

الحافظ البحر لم أسق ترجمته هنا لاتفاقهم على ترك حديثه، وهو من أوعية العلم لكنه لا يتقن الحديث، وهو رأس في المغازي و السیر، و یروی عن كل ضرب.

”حدیث کے حافظ اور سمندر تھے، میں ان کا ترجمہ یہاں اس لئے نہیں لایا کہ محدثین ان کی حدیث کو ترک کرنے پر متفق ہیں، یہ علم کا مخزن تھے، لیکن حدیث میں پختگی نہیں رکھتے تھے اور

مغازی دیر کے تو یہ سرآمد علماء میں سے ہیں، مگر ہر قسم کے لوگوں سے روایت لے لیتے ہیں۔“

(۶) ذیل تذکرة الحفاظ از حافظ ابوالحسن حسینی دمشقی المتوفی ۷۱۵ھ، یہ حافظ ذہبی کی مذکورہ کتاب کا ذیل ہے اور اس میں ان حفاظ حدیث کا تذکرہ ہے، جن کا ذکر ذہبی سے رہ گیا ہے، یہ کتاب دمشق میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔

(۷) نظم تذکرة الحفاظ از حافظ اسمعیل بن محمد المعروف بابن بروس المتوفی ۸۱۶ھ، اس کتاب کا ذکر حافظ ابن قہد نے علامہ ذہبی کی تذکرة الحفاظ پر جو ذیل لکھا ہے، اس میں کیا ہے، ابن بروس نے اس کتاب میں حافظ ذہبی کی مذکورہ کتاب کو نظم کر دیا ہے۔

(۸) بدیعة البیان فی وفيات الأعیان از حافظ شام ناصر الدین المتوفی ۸۳۲ھ یہ کتاب نظم میں ہے، جس میں تمام حفاظ حدیث کو نام بنام گنایا ہے۔

(۹) التبیان لبديعة البیان از حافظ ابن ناصر الدین مذکور، اس میں مصنف نے اپنے منظومہ بدیعة البیان کی شرح لکھی ہے، حافظ سخاوی نے ”الإعلان بالتوبيخ“ میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں ذہبی کی تذکرة الحفاظ پر چھبیس شخصوں کا اضافہ ہے۔

(۱۰) ذیل التبیان از حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ، یہ کتاب مذکور پر ذیل ہے اور اس میں ان حفاظ حدیث کا تذکرہ ہے کہ جو تبیان میں مذکور نہیں، سخاوی لکھتے ہیں کہ

”ہمارے شیخ (ابن حجر) نے تبیان پر ایک ذیل لکھا ہے، جو ایک

کراسہ میں ہے اور اس میں اٹھائیس اشخاص کا ذکر ہے“

(۱۱) طبقات الحفاظ از حافظ ابن حجر مذکور، اس میں صرف ان حفاظ

حدیث کو لیا ہے کہ جن کا ذکر حافظ جمال الدین مزنی کی تہذیب الکمال میں نہیں ہے، اچھی خاصی ضخیم کتاب ہے، جو حسب تصریح صاحب کشف الظنون دو جلدوں میں ہے۔

(۱۲) لحظ الألفاظ بذیل طبقات الحفاظ از حافظ

تقی الدین بن فہد التونی ۸۷ھ، یہ بھی حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ پر ذیل ہے اور دمشق میں طبع ہو کر شائع ہو گیا ہے۔

(۱۳) تذکرۃ الحفاظ از حافظ نجم الدین عمر بن فہد التونی ۸۸۵ھ،

یہ حافظ تقی الدین بن فہد مذکور کے صاحبزادے ہیں، اس کتاب میں انھوں نے ”تذکرۃ الحفاظ“ اور ”لحظ الألفاظ“ دونوں کے اشخاص کو بجائے طبقات کے حروف تہجی پر مرتب کر کے ایک نئی کتاب بنادی ہے، حافظ سخاوی نے ”الإعلان بالتوسیخ“ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

(۱۴) زیادات از حافظ شمس الدین سخاوی التونی ۹۰۲ھ یہ غالباً چھوٹا

سار سالہ ہے، جس میں ان حفاظ حدیث کو جمع کیا ہے کہ جن کا ذکر ذہبی کی ”تذکرۃ الحفاظ“ ابن ناصر الدین کی ”بديعة البیان“ اور ابن حجر کے ”ذیل علی البیان“ میں نہیں ہے، افسوس ہے کہ سخاوی نے الاعلان بالتوسیخ میں اس رسالہ کا نام نہیں لکھا صرف اتنا کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ ”ولی زیادات“۔

(۱۵) تذکرۃ الحفاظ و تبصرة الإیقاظ از علامہ یوسف بن

”اس کے اندر اس امت میں جو حفاظ حدیث گزرے ہیں، ان کے اسماء کا ذکر کروں گا۔۔۔۔۔۔ اور اس کتاب کو میں نے حروفِ معجم پر مرتب کیا ہے۔۔۔۔۔۔ لوگوں نے اس فن میں تصانیف کی ہیں، ابن الجوزی نے بھی کتاب الحفظ لکھی ہے، میں نے اس کو دیکھا تو اکثر حفاظ کا ذکر ان سے رہ گیا ہے، کیونکہ انہوں نے صرف سو کے قریب حفاظ کا تذکرہ لکھا ہے اور پھر محدثین کی اصطلاح میں جس کو حافظ کہتے ہیں، اس کا بھی لحاظ نہیں رکھا ہے، چنانچہ اذکیا اور نحو لغت کے ماہرین کی بھی ایک جماعت کا ذکر کر گئے ہیں، ذہبی نے بھی طبقات الحفظ تصنیف کی ہے، لیکن وہ میری نظر سے نہیں گزری۔“

حلب کے تکیہ اخلاصیہ کے کتب خانہ میں بھی اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

(۱۶) طبقات الحفاظ از حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ، یہ

ذہبی کے تذکرۃ الحفاظ کی تلخیص ہے، لیکن کہیں کہیں تراجم میں مفید اضافے بھی ہیں، میں نے اس کتاب کا قلمی نسخہ مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن کے کتب خانہ میں دیکھا ہے، عرصہ ہوا کہ یہ کتاب یورپ میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔

(۱۷) ذیل طبقات الحفاظ از حافظ سیوطی مذکور، یہ حافظ ذہبی کی

تذکرۃ الحفاظ کا ذیل ہے جس میں حافظ ذہبی کے معاصرین سے لیکر اپنے زمانے تک کے حفاظ حدیث کو ذکر کیا ہے، یہ کتاب دمشق میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ (۱)

حافظ سیوطی کے بعد بھی اگرچہ حفظ حدیث کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، لیکن ان کے حالات پر پھر کوئی مستقل کتاب ہمارے علم میں نہیں، اس لئے اگر حفاظ مابعد کے حالات معلوم کرنا ہوں تو پچھلی صدیوں کے علماء کے تراجم پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

یہ بھی واضح رہے کہ کتب تاریخ و تراجم میں جب کسی شخص کے ساتھ حافظ کا لقب مذکور ہوتا ہے، تو اس سے مراد حافظ قرآن نہیں بلکہ حافظ حدیث ہی ہوتا ہے، چنانچہ ہماری اس کتاب میں بھی جن علماء کے متعلق یہ لفظ آیا ہے اس سے یہی مراد ہے، تیسری صدی ہجری میں جس کثرت سے حفاظ حدیث گزرے ہیں، ان میں سے بعض کا تذکرہ آپ امام ابن ماجہ کے شیوخ کے سلسلہ میں پڑھ چکے ہیں۔

نظر کو بلند تر کیجئے جس امت نے حفاظ حدیث کے حالات کو اس طرح محفوظ کیا ہو، اس نے خود حدیث کے حفظ اور اس کی یادداشت میں کیا کچھ نہ اہتمام

(۱) حسینی، ابن فہد اور سیوطی تینوں کے ذیل مجموعہ تذکرۃ الحفاظ کے نام سے محدث کوثری مرحوم کی تصحیح و تعلق کے ساتھ دمشق کے مطبع التوفیق میں ۱۳۴۷ھ میں ایک ضخیم جلد کے اندر شائع ہوئے ہیں۔

کیا ہوگا۔ آج جب کہ موجودہ نسل نے اپنی قوت حافظہ کو معطل کر کے اسے بالکل بیکار اور مضحل بنا دیا ہے اور مطالعہ کے عالم وجود میں آ جانے کے باعث جو علم کہ اگلے علماء کے دماغوں میں تھا وہ ہمارے کتب خانوں میں منتقل ہو چکا ہے، حفظ حدیث کے واقعات کو کتنے ہی تعجب اور حیرت کی نظر سے کیوں نہ دیکھا جائے مگر حقیقت بہر حال حقیقت ہے، سلف کا ایک دور تھا کہ جب کتاب کا مسلمانوں میں بالکل رواج نہ تھا اور لوگ اپنے نوشتوں کو عیب کی طرح چھپایا کرتے تھے کہ مبادا ہم پر سوء حفظ کی تہمت نہ لگ جائے، اس دور میں کاغذ و قلم کی مدد کو عمار سمجھا جاتا تھا اور جو کچھ اساتذہ سے سنتے اسے صفحہ حافظہ پر ثبت کرنا پڑتا تھا، یہی وہ زمانہ ہے، جب ”علم سینہ بہ از علم سفینہ“ پر صحیح معنوں میں عملدرآمد تھا، حقیقت یہ ہے کہ جس شان کے ائمہ اس دور میں پیدا ہوئے بعد کو نہ ہو سکے، آج جتنے بھی اسلامی علوم کتابوں میں مدون ہیں ان سب کے اکابر علماء اسی عہد کی پیداوار ہیں، جب کہ حفظ کا دور دورہ تھا اور طریقہ تعلیم زبانی املاء تھا بعد کو جیسے جیسے علوم سینوں سے سفینوں میں آتے گئے کتابوں پر اعتماد بڑھتا گیا نتیجہ یہ کہ کتابوں میں سب کچھ رہا مگر دماغوں میں کچھ نہ رہا۔

تہذیب و تمدن حدیث

بہر حال یہ ایک واقعہ ہے کہ پہلی صدی ہجری میں ایک زمانے تک کتابت علم کا مسئلہ بڑا مختلف فیہ اور معرکہ الآراء بنا رہا، لیکن یہ اسی وقت تک رہا جب تک کہ علم عرب سے نکل کر عجم میں نہ پہنچا تھا، اہل عرب جو ہر چیز کو زبانی یاد رکھنے کے عادی تھے، انہیں لکھنا بڑا گراں گزرتا تھا، لیکن عجمی قومیں جن میں تحریر کا عام رواج تھا اور جو کتاب

خوانی کی پہلے سے عادی ہو چکی تھیں وہ عربوں کا سا خدا داد حافظہ کہاں سے لاتیں کہ ایک بار کے سننے سے سب یاد رہ جاتا۔

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) روز بروز اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور ابھی صدی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ بزمِ عالم ان کے مبارک وجود سے تقریباً خالی ہو چکی تھی، دوسری طرف شیعہ خوارج اور قدریہ نئے نئے فرقے اسلام میں سر اٹھاتے جاتے تھے، جو اپنے اپنے عقائد و خیالات کی ترویج میں پوری قوت سے کوشاں تھے، صحابہ کی موجودگی میں اہل بدعت کا زور نہ چلتا تھا، جب کسی چیز میں اختلاف ہوتا، لوگ ان کی طرف رجوع کرتے اور فتنہ دب کر رہ جاتا، امام بخاری نے تاریخ کبیر میں قتادہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو مورق کہنے لگے ”ذهب اليوم نصف العلم“ (آج نصف علم اٹھ گیا) جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ کیونکر؟ تو کہنے لگے کہ

كان الرجل من أهل الأهواء إذا خالفنا في الحديث قلنا تعال إلى من سمعه من النبي صلی اللہ علیہ وسلم۔ (۱)

”جب اہل بدعت میں سے کوئی شخص کسی حدیث کے بارے میں

ہماری مخالفت کرتا، تو ہم اس سے کہا کرتے تھے کہ لو آؤ ان کے

پاس چلو جنہوں نے اس کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔“

بصرہ کے صحابہ میں سب سے آخر میں جس نے وفات پائی، وہ حضرت انس

رضی اللہ عنہ ہیں، آپ کا انتقال ۹۳ھ یا ۹۵ھ میں ہوا ہے، یہ وہ وقت تھا کہ دوسرے اسلامی

(۱) تہذیب الجذب، ترجمہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

شہروں میں بھی دو چار کبیر الحسن صحابہ کے علاوہ کہ جو جلد ہی فوت ہو گئے، خورشید نبوت سے براہ راست کسب نور کرنے والے تمام ستارے غروب ہو چکے تھے۔

صفر ۹۹ھ میں خلیفہ صالح عادل بنی مروان حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سریر آرائے خلافت ہوئے، تو آپ نے دیکھا کہ صحابہ کے متبرک نفوس سے دنیا خالی ہو چکی، اکابر تابعین میں کچھ صحابہ کے ساتھ ہی چل بے، باقی جو ہیں ایک ایک کر کے سارے مقامات سے اٹھتے جا رہے ہیں، اس لئے آپ کو اندیشہ ہوا کہ ان حفاظ اہل علم کے اٹھنے سے کہیں علوم شرعیہ نہ اٹھ جائیں اور حدیث پاک کی جو امانت ان کے سینوں میں محفوظ ہے، وہ ان کے ساتھ ہی قبروں میں نہ چلی جائے، لہذا آپ نے فوراً تمام ممالک کے علماء کے نام فرمان بھیجا کہ حدیث نبوی کو تلاش کر کے جمع کر لیا جائے، چنانچہ حافظ ابو نعیم اصفہانی، تاریخ اصفہان میں روایت کرتے ہیں:

کتب عمر بن عبد العزیز، الی الافاق انظروا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوه۔ (۱)

”حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام آفاق میں لکھ بھیجا کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کر کے جمع کرو۔“

اسی سلسلہ میں مدینہ منورہ کے قاضی ابو بکر حزی کو جو آپ کی طرف سے وہاں کے امیر بھی تھے، جو فرمان بھیجا گیا اس کو امام محمد نے اپنی موطا میں بایں الفاظ روایت کیا ہے:

أخبرنا مالک أخبرنا يحيى بن سعيد أن عمر بن عبد العزيز

(۱) فتح الباری، باب کیف یقبض العلم۔

کتب الی ابی بکر بن عمرو بن حزم أن انظر ما كان من
حدیث رسول اللہ ﷺ أو سنته أو حدیث عمر أو نحو هذا
فاكتبه لي فاني خشيت دروس العلم و ذهاب العلماء
(باب اكتاب العلم).

”حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن عمرو بن حزم کو لکھا کہ
رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور سنت نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی
حدیثیں اور اسی قسم کی جو روایات مل سکیں، ان سب کو تلاش
کر کے مجھے لکھو، کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا
ہو جانے کا خوف ہے۔“

اس روایت میں حدیث (۱) عمر أو نحو هذا کے الفاظ خاص طور پر
قابل غور ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حدیث نبوی کے ساتھ ساتھ حضرت
عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر خلفاء کے آثار کی بھی جمع و تدوین کا حکم دیا تھا، سنن دارمی میں یہی
روایت عبداللہ بن دینار کی زبانی اس طرح منقول ہے۔

اكتب الي بما ثبت عندك من الحديث عن رسول الله ﷺ
وبحدیث عمر فاني خشيت دروس العلم و ذهاب العلماء
(باب من رخص في كتابة العلم)

”رسول اللہ ﷺ کی جو حدیثیں تمہارے نزدیک ثابت ہوں

(۱) سابق میں حافظ ستادی کی تصریح نقل کی جا چکی ہے کہ سلف میں صحابہ و تابعین کے اقوال کے لئے بھی حدیث
کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔

وہ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیثیں مجھے لکھ بھیجو، کیونکہ مجھے علم کے

مٹ جانے اور علماء کے فنا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔“

امام بخاری نے بھی کتاب العلم میں ترجمۃ الباب کے اندر اس فرمان کا ایک

حصہ تعلیقاً روایت کیا ہے، چنانچہ ”باب کیف یقبض العلم“ میں فرماتے ہیں:

وكتب عمر بن عبد العزيز إلى أبي بكر بن حزم انظر ما كان

من حدیث رسول الله ﷺ فاكتبه لي فإنني خشيت دروس

العلم وذهاب العلماء.

ولا يقبل إلا حدیث النبی ﷺ وليفشوا وليجلسوا حتی

يعلم من لا يعلم فإن العلم لا يهلك حتی يكون سراً.

”اور عمر بن عبدالعزیز نے ابو بکر بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ

ﷺ کی جو حدیثیں ہیں، ان کو تلاش کر کے مجھے لکھو، کیونکہ مجھے

علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہو جانے کا خوف ہے۔

اور حدیث نبوی کے سوا اور کچھ نہ قبول کیا جائے اور

لوگوں کو چاہئے کہ علم کی اشاعت کریں، اور درس کے لئے بیٹھیں

تا کہ جو لوگ نہیں جانتے وہ جان لیں، کیونکہ علم اس وقت تک

برباد نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ راز نہ بن جائے۔“

بعض لوگوں نے اس پوری عبارت کو فرمان کی عبارت سمجھ لیا ہے، حالانکہ

ذہاب العلماء تک جو خط کشیدہ الفاظ ہیں وہ فرمان کے ہیں اور لا یقبل سے امام

بخاری کی اپنی عبارت شروع ہوتی ہے، چونکہ امام بخاری آثار صحابہ کو حجت نہیں سمجھتے،

اس لئے ساتھ ہی اپنی رائے کا بھی اس سلسلہ میں اظہار کر گئے ہیں، مگر عبارت مذکورہ کے بعد جب انہوں نے اس تطبیق کی اسناد بیان کی تو تصریح کر دی ہے کہ یہ تطبیق ذہاب العلماء پر ختم ہو جاتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں حدثنا العلاء بن عبد الجبار حدثنا عبد العزيز بن مسلم عن عبد الله بن دينار بذلك

يعني حديث عمر بن عبد العزيز إلى قوله ذهاب العلماء. (۱)
امام مالک فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے قاضی صاحب موصوف کو یہ بھی لکھا تھا کہ عمرہ بنت عبد الرحمن اور قاسم بن محمد (*) کے پاس جو علم موجود ہے اس کو لکھ کر ان کے لئے بھیجیں۔ (۲)

اور ابن سعد لکھتے ہیں:

وكتب عمر بن عبد العزيز إلى ابن حزم أن يكتب له
أحاديث عمرة.

(۱) امام بخاری نے بھی حضرت عمر بن عبد العزیز کے فرمان کے لئے حدیث کا لفظ استعمال کیا ہے۔
(۲) تہذیب التہذیب، ترجمہ ابو بکر حزمی۔ (*) عمرہ اور قاسم کی روایات کے جمع کرنے کا خاص طور پر اس لئے حکم دیا کہ یہ دونوں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے برابر زادہ ہیں، امام بخاری نے ان کے متعلق تصریح کی ہے کہ ﴿قتل أبوہ فریبی بیما فی حجر عمته عائشة ففقه بها﴾ (تہذیب التہذیب ترجمہ قاسم) ”ان کے والد قتل کر دیئے گئے تھے اس لئے بحالت یتیمی اپنی عمر محترمہ کے آغوش میں تربیت پائی اور ان سے فقہ حاصل کیا۔“ یہ مدینہ طیبہ میں اپنے وقت کے افضل ترین علماء میں شمار کئے جاتے تھے چنانچہ ابن حبان کی کتاب ”الثقات“ میں آپ کے بارے میں یہ الفاظ ہیں کان من سادات التابعین من أفضل أهل زمانه علماً وأدباً وفقهاً۔
عمرہ بنت عبد الرحمن قاضی ابو بکر بن حزم کی والدہ کبوترہ بنت عبد الرحمن کی بہن تھیں اور اس بنا پر قاضی صاحب کی خالہ ہوتی ہیں، یہ بھی بڑی فقیہہ تھیں، چنانچہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں طبقہ ثالث (بقیہ اگلے صفحہ پر)

”عمر بن عبدالعزیز نے ابن حزم کو لکھا تھا کہ وہ انہیں عمرہ کی روایت کردہ حدیثیں لکھ کر بھیجیں۔“

قاضی ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم خزرجی انصاری اپنے وقت میں مدینہ طیبہ کے بہت بڑے فقیہ تھے، امام مالک فرماتے ہیں کہ ”ہمارے یہاں مدینہ میں جس قدر قضا کے بارے میں ان کو علم تھا، اتنا کسی کو نہ تھا، بڑے عابد شب زندہ دار تھے“ ان کی اہلیہ کا بیان ہے چالیس سال ہونے آئے یہ کبھی شب میں اپنے بستر پر دراز نہیں ہوئے، ان کی وفات بہ اختلاف اقوال ۱۱۰ھ یا ۱۱۱ھ یا ۱۲۰ھ میں ہوئی۔

قاضی صاحب موصوف نے امیر المومنین کے حسب الحکم حدیث میں متعدد کتابیں لکھیں، لیکن افسوس ہے کہ جب قاضی صاحب کا یہ کارنامہ پایہ کو پہنچا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز وفات پا چکے تھے، علامہ ابن عبدالبر التہمیدی میں امام مالک کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ

فتوفی عمر وقد کتب ابن حزم کتباً قبل أن یبعث بها إلیه. (۱)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) کے ختم پر جہاں اس عہد کے مشاہیر علماء تابعین کے نام گنائے ہیں ان کا تذکرہ اسی لقب سے کیا ہے، ان کی وسعت علم کا یہ عالم تھا کہ امام زہری فرماتے ہیں ”مجھ سے قاسم بن محمد فرمانے لگے ”میں تمہیں علم کا شوقین پاتا ہوں اس لئے تمہیں علم کا مخزن نہ بتا دوں“ میں نے کہا کیوں نہیں“ فرمانے لگے عمرہ بنت عبدالرحمن کے آستانہ کو پکڑ لو کیونکہ وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے آغوش تربیت میں پلی بڑھی ہیں، چنانچہ جب میں ان کی خدمت میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ ختم ہونے والا سندہ ہیں، فوج دہشہا بحرلاً بنزف (تذکرہ انکشاف ترجمہ امام زہری) خود حضرت عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ مابقی احذاً علم بحديث عائشة من عمرة (حضرت عائشہ کی حدیث کا عالم عمرہ سے بڑھ کر کوئی بات نہیں رہا) عمرہ کی وفات بہ اختلاف اقوال ۹۸ھ یا ۱۰۳ھ یا ۱۰۶ھ میں ہوئی۔

(۱) مقدمہ تنویر الحواک۔

”ابن حزم نے متعدد کتابیں لکھیں، پر حضرت عمر بن عبدالعزیز قبل اس کے کہ ابن حزم یہ کتابیں ان کی خدمت میں بھیجیں وفات پا گئے۔“

تہذیب المعتمدیہ میں امام مالک سے یہ بھی منقول ہے کہ میں نے ان کتابوں کے متعلق قاضی صاحب کے صاحبزادے عبداللہ بن ابی بکر سے پوچھا تھا، تو انہوں نے جواب دیا کہ ”ضاعت“ (وہ ضائع ہو گئیں) (۱)

بعض اور روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے قاضی ابوبکر بن حزم کے علاوہ مدینہ شریف کے اور علماء کو بھی اس سلسلہ میں لکھا تھا، چنانچہ علامہ سیوطی، تاریخ الخلفاء میں امام زہری سے ناقل ہیں کہ ”حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سالم بن عبداللہ کو لکھا تھا کہ صدقات کے بارے میں حضرت عمرؓ کا جو معمول رہا ہے، وہ ان کو لکھ کر بھیجیں، چنانچہ سالم نے جو کچھ انہوں نے پوچھا تھا وہ ان کو لکھ کر بھیجا۔“ (۲)

خود امام زہری کو بھی جن کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی شہادت ہے کہ

لم یبق أحد أعلم بسنة ماضية من الزهري (۳)

(۱) تہذیب المعتمدیہ ترجمہ ابوبکر حزمی۔

(۲) تاریخ الخلفاء ص ۱۶۱ طبع مجتہائی دہلی۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ امام زہری۔

”گذشتہ سنت کا زہری سے بڑھ کر کوئی عالم باقی نہ رہا۔“

خاص طور پر تدوین سنن پر معمور فرمایا، چنانچہ علامہ ابن عبدالبر ”جامع بیان العلم“ میں امام زہری کا بیان نقل کرتے ہیں:

أمرنا عمر بن عبدالعزيز بجمع السنن فكتبناها دفتراً دفتراً

فبعث إلى كل أرض له عليها سلطان دفتراً. (۱)

”ہم کو عمر بن عبدالعزیز نے سنن کے جمع کرنے کا حکم دیا تو ہم

نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے اور پھر انہوں نے ہر اس سرزمین پر کہ

جہاں ان کی حکومت تھی ایک دفتر بھیج دیا۔“

امام زہری کے ان دفاتر کی ضخامت کا اندازہ لگانا ہو تو مقرر کا حسب

ذیل بیان پڑھئے۔

”پہلے ہم یوں سمجھتے تھے کہ ہم نے زہری سے بہت کچھ حاصل کیا

لیکن جب ولید بن یزید قتل ہوا تو سرکاری خزانے سے زہری کے

علمی دفاتر سوار یوں پر بار کر کے لائے گئے۔“ ۲

امام زہری کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قاضی ابوبکر

بن حزم سے پہلے اس فن کی تدوین کی ہے، کیونکہ ان کی جمع کردہ کتابوں کی نقل

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد خلافت میں تمام ممالک محروسہ میں بھیج دی

تھی، لیکن قاضی ابوبکر بن حزم ابھی اپنی کتابیں مکمل کر کے بارگاہ خلافت تک بھیجنے

(۱) جامع بیان العلم باب ذکر الرصد فی کتاب العلم۔

(۲) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ امام زہری۔

بھی نہ پائے تھے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات ہوگئی، اس لحاظ سے اس سلسلہ میں اولیت کا سہرا امام زہری کے سر ہے، چنانچہ حافظ ابن عبدالبر جامع بیان العلم میں امام مالک کی تصریح نقل کی ہیں:

أول من دَوَّن العلم ابن شہاب.

”سب سے پہلے جس نے علم مدون کیا، وہ ابن شہاب (زہری) ہیں۔“

مدینہ کے ایک اور امام عبدالعزیز دراوردی بھی امام موصوف کے معاصر

ہیں، یہی فرماتے ہیں کہ ”أول من دَوَّن العلم وكتبه ابن شہاب.“ (۱)

بلاشبہ جیسا کہ ان دونوں بزرگوں کی تصریح ہے مدینہ طیبہ میں اولیت کا شرف اس بارے میں امام زہری ہی کو حاصل ہے، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تدوین احادیث کے لئے صرف اہل مدینہ کو نہیں بلکہ تمام علماء آفاق کو لکھا تھا چنانچہ اس کے متعلق حافظ ابو نعیم اصفہانی کی روایت سابق میں آپ کی نظر سے گزر چکی، خود دارالحلاف دمشق میں اس وقت شام کے مشہور امام اور فقیہ مکحول دمشقی موجود تھے، ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں ان کی تصنیفات کے سلسلہ میں کتاب السنن کا ذکر کیا ہے، اغلب یہ ہے کہ اس کی تدوین بھی امر خلافت کی تعمیل ہی میں ہوئی ہوگی، مکحول کی جلالت علمی کا اندازہ کرنا ہو تو خود امام زہری کا حسب ذیل بیان پڑھئے۔

”علماء چار ہیں: (۱) سعید بن المسیب، مدینہ میں، (۲) شعبی، کوفہ

میں، (۳) حسن بصری، بصرہ میں، اور (۴) مکحول، شام میں۔“ (۲)

(۱) جامع بیان العلم، باب ذکر الرخصة فی کتاب العلم۔

(۲) الاکمال فی اسماء الرجال از صاحب مشکوٰۃ ترجمہ مکحول۔

امام اوزاعی نے فقہ کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی تھی، چنانچہ کتب رجال میں ان کے وصف میں ”معلم الأوزاعی“ کے الفاظ خصوصیت سے نقل کئے جاتے ہیں۔ (۱)
علامہ التابعین امام شعبی کے متعلق بھی علامہ سیوطی، تدریب الراوی میں حافظ ابن حجر عسقلانی سے ناقل ہیں کہ

أما جمع حديث إلى مثله فقد سبق إليه الشعبي، فإنه روى عنه أنه قال هذا باب من الطلاق جسيم وساق فيه أحاديث. (۲)
”ایک مضمون کی حدیثوں کے جمع کرنے کا کام سب سے پہلے امام شعبی نے کیا کیونکہ ان سے مروی ہے کہ انھوں نے بیان کیا ”هذا باب من الطلاق جسيم“ (یہ طلاق کا ایک بڑا باب ہے) اور پھر اس کے متعلق حدیثیں روایت کیں۔“

امام شعبی کتابت علم کے قائل نہ تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ احادیث کے جمع کرنے کا یہ کام انہوں نے محض خلیفہ عادل کے حکم کی تعمیل ہی میں کیا ہوگا، بالخصوص جبکہ امام یحییٰ بن معین نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو عہدہ قضا تفویض کیا تھا (۳) حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ یہ کوفہ میں قاضی تھے، (۴) شعبی کے بارے میں امام زہری کی رائے ابھی آپ کی نظر سے گزری، مکحول کا قول ہے

ما رأيت أعلم من الشعبي.
”شعبی سے بڑا عالم میری نظر سے نہیں گزرا“

(۱) الاكمال فی اسماء الرجال از صاحب مشکوٰۃ ترجمہ مکحول۔ (۲) تدریب الراوی ص ۲۴ طبع مصر ۱۳۰۷ھ۔
(۳) تہذیب التہذیب ترجمہ امام شعبی۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ امام شعبی۔

ابو جحز کہتے ہیں:

ما رأيت أحداً أفقه من الشعبي لا سعيد بن المسيب ولا طاؤس ولا عطاء ولا الحسن ولا ابن سيرين.

”شعبي سے بڑھ کر کوئی فقیہ میں نے نہ دیکھا، نہ سعید بن

المسيب، نہ طاؤس، نہ عطاء، نہ حسن بصری اور نہ ابن سيرين۔“

عاصم احوال کا بیان ہے:

ما رأيت أحداً أعلم بحديث أهل الكوفة والبصرة والحجاز من الشعبي.

”میں نے اہل کوفہ، اہل بصرہ اور اہل حجاز کی حدیثوں کا شعبي

سے بڑھ کر عالم نہیں دیکھا“

خود شعبي کا بیان ہے کہ میں نے پانچ موصحابہ کو پایا ہے، ابن شرمہ نے ایک مرتبہ امام شعبي کو یوں فرماتے سنا کہ ”میں سال ہوئے کبھی کسی شخص سے کوئی ایسی حدیث نہیں سنی کہ جس کا مجھے اس سے زیادہ علم نہ ہو“ (۱) فن حدیث میں یہ امام اعظم کے اکابر شیوخ میں شمار کئے جاتے ہیں، چنانچہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں ان کے تلامذہ فن حدیث میں امام ابو حنیفہ کا نام لیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی تصریح کر دی ہے ”وہو اکبر شیخ لأبي حنيفة“ (کہ یہ امام ابو حنیفہ کے بڑے شیخ ہیں)۔

امام زہری، امام مکحول اور امام شعبي ان تینوں میں سب سے پہلے امام شعبي نے قضا کی، کیونکہ ان کی وفات بہ اختلاف اقوال ۱۰۳ھ سے لیکر ۱۱۰ھ کے اندر اندر ہوئی ہے اور امام مکحول نے بہ اختلاف اقوال ۱۱۲ھ سے لیکر ۱۱۸ھ کے اندر انتقال کیا

(۱) یہ سب اقوال تذکرۃ الحفاظ میں امام شعبي کے ترجمہ میں مذکور ہیں۔

ہے، اور امام زہری نے ۱۲۳ھ یا ۱۲۴ھ یا ۱۲۵ھ میں تصانیف کی ہے۔

چونکہ یہ تینوں ائمہ باہم معاصر ہیں (گو امام شافعی عمر اور علم میں ان دونوں سے بڑے تھے) اس لئے یقین کے ساتھ تو یہ فیصلہ کرنا سخت مشکل ہے کہ سب سے پہلے اس موضوع پر کس نے قلم اٹھایا، تاہم حسب تصریح امام مالک و دراوردی اگر ”اس علم کے پہلے مدون امام ابن شہاب زہری ہیں“ (بشرطیکہ اس اولیت کو مدینہ کے ساتھ خاص نہ سمجھا جائے بلکہ تمام بلاد اسلامیہ کے اعتبار سے عام رکھا جائے) تو امام شافعی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ احادیث نبوی کی تبویب سب سے پہلے انھیں نے کی ہے، اس لئے تدوین حدیث کی اولیت کا سہرا اگر علماء اہل مدینہ کے سر ہے تو اس کی تبویب کی اولیت کا شرف یقیناً علماء اہل کوفہ کو حاصل ہے۔

دوسری صدی ہجری کی تصنیفات

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ۲۵ھ جب ۱۰ھ کو انتقال کیا، آپ کی مدت خلافت کل دو سال پانچ ماہ ہے، امام شافعی، امام زہری، امام کھول دمشقی اور قاضی ابوبکر حزمی کی تصانیف اسی عہد عمری کی یادگار ہیں اور اغلب یہ ہے کہ ان تصنیفات کا بیشتر حصہ پہلی صدی کے ختم ہونے سے پہلے تیار ہو چکا تھا۔

بہر حال پہلی صدی کے آخر میں خلیفہ راشد کے حکم سے کبار ائمہ تابعین نے جمع و تدوین حدیث کا دروازہ کھولا اور دوسری صدی ہجری میں اس سلسلہ کو اتنی ترقی ہوئی کہ احادیث مرفوعہ ایک طرف صحابہ کے آثار اور تابعین کے فتاویٰ اور اقوال تک ایک ایک کر کے اس عہد کی تصنیفات میں مرتب و مدون کر دیئے گئے۔

کتاب الآثار

فقہ وقت حماد بن ابی سلیمان کی وفات کے بعد ۱۲۰ھ میں امام ابو حنیفہ جب جامع کوفہ کی اس مشہور علمی درسگاہ میں مسند فقہ و علم پر جلوہ آرا ہوئے کہ جو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۱) کے زمانہ سے باقاعدہ طور پر چلی آرہی تھی، تو آپ نے جہاں علم کلام کی بنیاد ڈالی، فقہ کا عظیم الشان فن مدون کیا، وہیں علم حدیث کی ایک اہم ترین خدمت یہ انجام دی کہ احادیث احکام میں سے صحیح اور معمول بہ روایات کا انتخاب فرما کر ایک مستقل تصنیف میں ان کو ابواب فقہیہ پر مرتب کیا، جس کا نام کتاب الآثار ہے، اور آج امت کے پاس احادیث صحیحہ کی سب سے قدیم ترین کتاب یہی ہے، جو دوسری

(۱) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازلة الخفاء عن خلافة الخلفاء میں تصریح کی ہے کہ فقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں:

چوں لوازم خلافت خاصہ مبین شد، الحال باید شناخت کہ بتعے کثیر اصحابہ فیض صحبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدر حمیر ازیں اوصاف حاصل کردہ بودند بعض ایشان بخلاف مقیدہ فائز گشت مانند عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ و قرأت و فقہ (ازلة الخفاء ص ۱۸ طبع صدیقی بریلی ۱۳۸۶ھ) اور جب خلافت خاصہ کے لوازم بیان کر دئے گئے تو اب معلوم کرنا چاہئے کہ صحابی کی ایک کثیر جماعت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے ان اوصاف کا ایک معتد بہ حصہ حاصل کیا تھا، اور بعض ان میں سے خلافت مقیدہ پر فائز ہوئے تھے، جیسے کہ قرأت اور فقہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہوئے ہیں۔“

اور اسی چیز کی مزید تشریح شاہ صاحب نے دوسرے مقام پر اس طرح کی ہے:

وازلوازم خلافت خاصہ آنست کہ قول خلیفہ حجت باشد در دین نہ بآں معنی کہ تقلید عوام مسلمین اور اصحاب باشد زیرا کہ ایں معنی از لوازم اجتہاد است و در خلافت عامہ بیان آن گذشت و نہ بہ آں معنی کہ خلیفہ فی نفسہ بے اعتماد بر جمیع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واجب الطاعت باشد زیرا کہ ایں معنی غیر نبی را میسر نیست بلکہ مراد اینجا منزلتے ست بین المرئیین۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

صدی کے رُبع ثانی کی تالیف ہے، امام ابو حنیفہ سے پہلے حدیث نبوی کے جتنے صحیفے اور مجموعے لکھے گئے، ان کی ترتیب فی نہی تھی بلکہ ان کے جامعین نے کیف ما اتفق جو حدیثیں ان کو یاد تھیں انھیں قلمبند کر دیا تھا، امام شافعی نے بیشک بعض مضامین کی حدیثیں ایک ہی باب کے تحت لکھی تھیں، لیکن وہ پہلی کوشش تھی جو غالباً چند ابواب سے آگے نہ بڑھ سکی، علاوہ ازیں شافعی کے الفاظ ”هذا باب من الطلاق جسيم“ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے باب کو ٹھیک ان معنوں میں استعمال کیا ہے کہ جس معنی میں بعد کے مصنفین لفظ ”کتاب“ کا استعمال کرتے ہیں، اس لئے احادیث کو کتب و ابواب پر پوری طرح مرتب کرنے کا کام ابھی باقی تھا، جس کو امام ابو حنیفہ نے کتاب الآثار تصنیف کر کے نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ مکمل فرمایا اور بعد کے ائمہ کے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) تفصیل اس صورت آنت کہ آنحضرت ﷺ حوالہ فرمودہ اند بعض امور را بشخصه مخصوص اسم او پس لازم شود متابعت او چنانکہ لازم می شود متابعت امراء نبیوش آنحضرت ﷺ بمقتضائے امر آنحضرت ﷺ و اس خصلت در خلفاء راشدین بہماں می ماند کہ قول زید بن ثابت را در فرض مقدم باید ساخت بر اقوال مجتہدین دیگر و قول عبداللہ بن مسعود در قرأت و فقہ (ازالۃ الخفاء ص ۱۵) ”اور خلافت خاصہ کے لوازم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خلیفہ کا قول دین میں حجت ہو بایں معنی نہیں کہ عوام مسلمین کے لئے اس کی تقلید صحیح ہے، کیونکہ یہ چیز تو لوازم اجتہاد میں سے ہے اور خلافت عامہ کے سلسلہ میں اس کا بیان گذر چکا اور بایں معنی بھی نہیں کہ خلیفہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے اجازت ہوئے بغیر بھی واجب الطاعت ہے، کیونکہ یہ بات نبی کے علاوہ اور کسی کو میر نہیں بلکہ اس جگہ ان دونوں کے مابین جو درجہ ہے وہ مراد ہے۔

اس صورت کی تفصیل یہ ہے کہ اس حضرت ﷺ نے بعض امور کو خاص طور پر کسی ایک شخص کا نام لیکر اس کے حوالہ فرمایا ہے اس لئے اس شخص کی اتباع اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ آپ کے لشکر کے امراء کی اتباع خود آپ کے بموجب لازم ہے اور یہ بات خلفاء راشدین کے بارے میں بالکل اسی طرح ہے جس طرح سے کہ زید بن ثابت کے قول کو کفر انش (علم میراث) میں اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے قول کو قرأت اور فقہ میں دوسرے مجتہدین کے اقوال پر مقدم رکھنا چاہئے۔

لئے ترتیب و تبویب کا ایک عمدہ نمونہ قائم کر دیا۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ کتاب الآثار کو احادیث صحیحہ کا اولین مجموعہ بتانے پر چونکیں، اس لئے اس حقیقت کو آشکارا کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ صحیح بخاری سے پہلے کوئی کتاب احادیث صحیحہ کی مدون نہیں کی گئی وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں، حافظ سیوطی، تویر الحوالہ میں لکھتے ہیں:

وقال الحافظ مغلطانی أول من صنف الصحيح مالک، وقال الحافظ ابن حجر کتاب مالک صحیح عنده و عند من یقلده علی ما اقتضاه نظره من الإحتجاج بالمرسل والمنقطع وغيرهما، قلت ما فيه من المراسيل فإنها مع كونها حجة عنده بلا شرط وعند من وافقه من الأئمة علی الإحتجاج بالمرسل فهي حجة أيضاً عندنا لأن المرسل عندنا حجة إذا اعتضد وما من مرسل في الموطأ إلا وله عاضد أو عواضد كما سألين ذلك في هذا الشرح فالصواب إطلاق أن الموطأ صحيح كله لا يستثنى منه شيئاً. (۱)

”اور حافظ مغلطانی نے کہا ہے کہ پہلے جس نے صحیح تصنیف کی وہ مالک ہیں، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ مالک کی کتاب خود ان کے نزدیک اور ان کے مقلدین کے نزدیک صحیح ہے، کیونکہ ان کی نظر مرسل اور منقطع وغیرہ سے احتجاج کی مقتضی ہے (سیوطی کہتے

ہیں) میں کہتا ہوں موطا میں جو مراسیل ہیں، وہ علاوہ اس امر کے کہ وہ بلا کسی شرط کے مالک اور ان ائمہ کے نزدیک کہ جو مرسل کو ان کی طرح سند مانتے ہیں، حجت ہیں، ہمارے نزدیک بھی حجت ہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک جب مرسل کا کوئی مؤید موجود ہو تو وہ حجت ہوتی ہے اور موطا میں کوئی مرسل روایت ایسی موجود نہیں کہ جس کا ایک یا ایک سے زائد مؤید موجود نہ ہو، چنانچہ میں اپنی اس شرح میں اس کو بیان کروں گا، اس لئے حق یہی ہے کہ کل موطا کو صحیح کہا جائے اور اس سے کسی چیز کو مستثنیٰ نہ کیا جائے۔“

امام سیوطی نے حافظ مغلطائی کے جس بیان کا حوالہ دیا ہے، وہ خود ان کی زبان سے سننا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، علامہ محمد امیر میاں، ”توضیح الافکار شرح تنقیح النظر“ میں رقمطراز ہیں کہ

أول من صنف في جمع الصحيح البخاري، هذا كلام ابن الصلاح، قال الحافظ ابن حجر أنه اعترض عليه الشيخ معنصاني فيما قرأه بخطه فإن مالكا أول من صنف الصحيح، وتلاه أحمد بن حنبل وتلاه الدارمي قال وليس لقائل أن يقول لعلمه أراد الصحيح المجرد فلا يرد كتاب مالك لأن فيه البلاغ والموقوف والمنقطع والفقه وغير ذلك لوجود ذلك في كتاب البخاري، انتهى. (۱)

”پہلے جس نے جمع صحیح میں تصنیف کی، وہ بخاری ہیں، یہ ابن صلاح کا بیان ہے حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس پر شیخ مغلطائی نے اعتراض کیا ہے، چنانچہ انھوں نے خود ان کی تحریر میں پڑھا ہے کہ ”پہلے جس نے صحیح تصنیف کی وہ مالک ہیں، ان کے بعد احمد بن حنبل اور پھر دارمی اور کسی کو یہ اعتراض کا حق نہیں کہ غالباً ابن صلاح کی مراد صحیح سے صحیح مجرد ہے، لہذا مالک کی کتاب اس سلسلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی، کیونکہ اس میں بلاغ، موقوف، منقطع، اور فقہ وغیرہ بھی موجود ہے، اس لئے کہ یہ سب چیزیں تو بخاری کی کتاب میں بھی پائی جاتی ہیں۔“

بلاشبہ علامہ مغلطائی کے نزدیک اس بارے میں اولیت کا شرف امام مالک کو حاصل ہے، لیکن کتاب الآثار، مؤطا سے پہلے کی تصنیف ہے، جس سے خود مؤطا کی تالیف میں استفادہ کیا گیا ہے چنانچہ حافظ سیوطی تبیيض الصحيفة في مناقب الإمام أبي حنيفة میں تحریر فرماتے ہیں:

من مناقب أبي حنيفة النسي انفراد بها أنه أول من دون علم الشريعة ورتبه أبا بآء، ثم تبعه مالک بن أنس في ترتيب المؤطا ولم يسبق أبا حنيفة أحد. (۱)

”امام ابو حنیفہ کے ان خصوصی مناقب میں سے کہ جن میں وہ منفرد ہیں ایک یہ بھی ہے وہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم

(۱) تبیيض الصحیفة ص ۳۶، طبع دائرة المعارف حیدرآباد، دکن ۱۳۳۲ھ۔

شریعت کو مدون کیا اور اس کی ابواب پر ترتیب کی، پھر امام مالک
ابن انس نے مؤطا کی ترتیب میں ان ہی کی پیروی کی اور اس
بارے میں امام ابو حنیفہ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں۔“

امام ابو حنیفہ کی تصانیف سے امام مالک کے استفادہ کا ذکر کتب تاریخ میں
صراحت سے مذکور ہے، قاضی ابوالعباس احمد بن محمد بن عبد اللہ بن ابی العوام، اخبار ابی
حنیفہ میں بسند متصل عبدالعزیز بن محمد در اور دسی سے روایت کرتے ہیں کہ امام مالک،
امام ابو حنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے۔ (۱)

(۱) اقوام المسالک فی بحث روایۃ مالک عن ابی حنیفہ، در ولیۃ ابی حنیفہ مالک، از محدث کوثری، ص ۶۸، یہ کل
چھ صفحات کا رسالہ ہے جو احتیاج الحق طبع مصر ۱۳۶۰ھ کے آخر میں طبع ہوا ہے، بعض علماء نے امام مالک سے روایات کے
سلسلہ میں جہاں ان کے بعض مشائخ مثلاً امام زہری، سیحہ الرازی، یحییٰ بن سعید انصاری وغیرہ کا نام لیا ہے امام
ابو حنیفہ کے متعلق بھی تصریح کی ہے کہ یہ امام مالک سے حدیث روایت کرتے ہیں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ
میں اشہب کی زبانی نقل کیا ہے کہ روایت أباحنیفہ بین یدی مالک کالصبی بین یدی أبیه۔ ”میں نے
امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے سامنے اس طرح دیکھا جس طرح بچہ اپنے باپ کے سامنے ہو۔“

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اسی بنا پر یہ خیال کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو باقاعدہ امام
مالک سے فن حدیث میں تلمذ تھا اور وہ ان کے حلقہ درس میں حاضر ہوتے تھے چنانچہ علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ العبدان
میں فرماتے ہیں:

”اس عظمت کے ساتھ امام صاحب کو طلب علم میں کسی سے عار نہ تھی، امام مالک عمر میں ان
سے تیرہ برس کم تھے، ان کے حلقہ درس میں بھی اکثر حاضر ہوئے اور حدیثیں سنیں، علامہ
ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ”امام مالک کے سامنے ابو حنیفہ اس طرح مؤدب
بیٹھتے تھے، جس طرح شاگرد استاد کے سامنے بیٹھتا ہے۔“ اس کو بعض کتابہ بینوں نے امام کی
کبر شان پر محمول کیا ہے، لیکن ہم اس کو علم کی قدر شناسی اور شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں، امام
مالک بھی ان کا نہایت احترام کرتے تھے، عبد اللہ بن مبارک کی زبانی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کتاب الآثار میں جو احادیث ہیں وہ موطا کی روایت سے قوت و صحت میں کم نہیں، ہم نے خود اس کے ایک ایک راوی کو جانچا اور ایک ایک روایت کو پرکھا ہے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) منقول ہے کہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا ایک بزرگ آئے، جن کی انھوں نے نہایت تعظیم کی اور اپنے برابر بیٹھایا اور ان کے جانے کے بعد فرمایا ”جانتے ہو یہ کون شخص تھا، یہ ابو حنیفہ عراقی تھے، جو اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔“ ذرا دیر کے بعد ایک اور بزرگ آئے امام مالک نے ان کی بھی تعظیم کی، لیکن نہ اس قدر جتنی ابو حنیفہ کی کی تھی، وہ اٹھ گئے، تو لوگوں سے کہا یہ سفیان ثوری تھے۔ (ص ۷۷ طبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۲ء)

اور مولانا سید سلیمان ندوی، حیات امام مالک میں امام مدوح کی مجلس کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”تمام لوگ سرنگوں خاموش بیٹھے تھے یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ بھی جب امام کی مجلس درس میں آکر شریک ہوئے تو وہ بھی اسی طرح مذہب ہو کر بیٹھے۔“ (ص ۳۲) اور پھر امام مالک کے تلامذہ و مستفیدین کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہ کا نام لکھ کر حاشیہ میں رقمطراز ہیں:-

”رواہ مالک للخطیب لبغدادی، ابن عساکر، مسند امام ابو حنیفہ لابن خضرو، دار قلمی کتاب الذبائح، بدر الدین زرکشی فی النکت علی ابن الصلاح، مسند ابو حنیفہ لابن الغضائہ، اکمال الاکمال قلمی کتب خانہ بانکی پور (فن حدیث نمبر ۷۴) شرح زرکانی (ج ۱ ص ۳) ترمذی، ابن ابی شیبہ، محللی شرح موطا مولانا عبد السلام خٹکی قلمی مقدمہ ان تمام کتابوں میں امام ابو حنیفہ کے استفادہ کا ذکر ہے۔“

بلاشبہ امام عظیم کے لئے اگرچہ وہ طبقہ میں امام مالک سے بڑے ہیں یہ چیز قطعاً باعث عار نہیں کہ وہ امام مالک کے حلقہ درس میں بیٹھیں اور ان سے حدیثوں کا سماع کریں، بلکہ محدثین کا یہ قول ہے کہ ایک محدث اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اہل، ہمسر اور کثر تینوں طبقوں سے روایت نہ کرے (مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۱۱ طبع حلب) امام مالک تو بہر حال امام صاحب کے اقران میں سے ہیں امام صاحب نے تو اپنے تلامذہ تک سے حدیثیں روایت کی ہیں، چنانچہ امام خراسان ابراہیم بن طہمان کے ذکر میں اس کی تصریح گزر چکی ہے لیکن مولانا تو روایت اقران کے لئے حلقہ درس میں حاضر ہونا ضرور نہیں، مذاکرہ کے ضمن میں بھی روایت ہو سکتی ہے، تاہنا امام ابو حنیفہ کا امام مالک سے حدیث روایت کرنا خوف حقان ثبوت ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی النکت علی مقدمہ ابن الصلاح میں لکھتے ہیں: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور جس طرح مؤطا کے مراسیل کے موید موجود ہیں اسی طرح اس کے مراسیل کا حال ہے، اس لئے صحت کے جس معیار پر حافظ مغلائی اور حافظ سیوطی کے نزدیک مؤطا

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) إِنَّ أَبَا حَنِيفَةَ لَمْ تَنْتِ رِوَايَةً عَنْ مَالِكٍ وَإِنَّمَا أَوْرَدَهُ الدَّارُ قُطْنِي ثُمَّ الْخَطِيبُ فِي الرِّوَاةِ عَنْهُ لِرِوَايَتَيْنِ وَقَعْنَا لِهَمَا بِإِسْنَادَيْنِ فِيهِمَا مَقَالٌ وَهُمَا لَمْ يَلْتَزِ مَا فِي كِتَابَيْهِمَا الصَّحَّةُ. (نکت ابن حجر کا قلمی نسخ کتب خانہ پیر جھنڈ و حیدر آباد سندھ میں ہماری نظر سے گزرا ہے اور یہ عبارت اسی سے نقل کی ہے۔)

”بلاشبہ امام ابو حنیفہ کا امام مالک سے روایت کرنا ثابت نہیں اور دار قطنی اور ان کے بعد خطیب نے رواۃ مالک میں اس کو محض اس لئے بیان کیا کہ ان کو ایسی دو روایتیں ملی تھیں، یہ دونوں روایتیں دو مختلف اسناد سے ہیں ان دونوں کی صحت میں کلام ہے، اور خود دار قطنی اور خطیب نے اپنی ان دونوں کتابوں میں صحت کا التزام نہیں کیا ہے۔“

اور دہمبی نے اشہب سے کچھ نقل کیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، محدث محمد زاہد کوثری، اقام السالک میں فرماتے ہیں: فَمَا يَرْوِيهِ الذَّهَبِيُّ فِي تَرْجُمَةِ مَالِكٍ فِي طَبَقَاتِ الْحِفَافِ عَنْ أَشْهَبَ لَا يَصِحُّ إِلَّا إِذَا كَانَ فِي حَقِّ حَمَادِ بْنِ أَبِي حَنِيفَةَ دُونَ أَبِيهِ لِأَنَّهُ مَوْلَا أَشْهَبَ (۱۴۵ھ) كَمَا يَقُولُ ابْنُ يُونُسَ إِنَّ لَمْ يَكُنْ لِدَةِ الشَّافِعِيِّ وَمِثْلُهُ لَا يُمْكِنُ أَنْ يَرْحَلَ مِنْ مِصْرَ إِلَى الْمَدِينَةِ الْمُنَوَّرَةِ وَيَرْوِيَ أَبَا حَنِيفَةَ عِنْدَ مَالِكٍ أَصْلًا (ص ۷)

”طبقات الحفاظ میں امام مالک کے ترجمہ میں جو کچھ ذہبی اشہب سے نقل کرتے ہیں وہ صحیح نہیں، بجز اس کے کہ یہ بیان حماد بن ابی حنیفہ کے متعلق ہو، نہ کہ خود ان کے والد ماجد کے متعلق، کیونکہ اشہب کا سنہ ولادت جس صورت میں کہ ان کو امام شافعی کا مہسن نہ تسلیم کیا جائے، حسب بیان ابن یونس ۱۴۵ھ ہے اور اس عمر کے بچہ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ مصر سے سفر کر کے مدینہ منورہ جائے اور امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے یہاں دیکھ سکے۔“

اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اس سلسلہ میں جن کتابوں کے حوالے دیئے ہیں ان میں بجز مؤخر الذکر چار کتابوں کے غالباً بقیہ کتب سے مولانا نے براہ راست مراجعت نہیں کی ہے، بلکہ ان ہی کتابوں سے ان کے بھی حوالے نقل کر دیئے ہیں، ابن عساکر، دار قطنی اور مسند ابن خضرو کی سند میں عمران بن عبد الرحیم موجود ہے، جس کے بارے میں حافظ سلیمان نے تصریح کی ہے کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

صحیح قرار پائی ہے، ٹھیک اسی معیار پر کتاب الآثار صحیح اترتی ہے، موطا کو کتاب الآثار سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) هو الذي وضع حديث أبي حنيفة عن مالك (ميزان الاعتدال، امام ذہبی)

”ابو حنیفہ عن مالک والی روایت اسی نے وضع کی ہے۔“

دارقطنی نے یہ روایت ”کتاب الذبائح“ میں نہیں بلکہ کتاب المذبح میں کی ہے، جو ان کی مشہور تصنیف ہے اور جس کا موضوع روایات اقران کا بیان ہے (تدریب الراوی ص ۲۰) اور تزئین الممالک میں اس مقام پر اس کی بجائے کتاب الذبائح غلط طبع ہو گیا ہے اور محدث ابن خسر نے اپنی سند میں جہاں اس کو روایت کیا ہے پہلے ہی تصریح کر دی ہے کہ

”حافظ ابو عبد اللہ محمد بن خالد الطحاوی نے اس روایت کو اپنی کتاب مارواہ الاکابر عن مالک میں

بواسطہ حماد بن ابی حنیفہ عن مالک نقل کیا ہے اور اس سند میں امام ابو حنیفہ کا ذکر نہیں ہے۔“

(ملاحظہ ہو جامع مسانید الامام الاعظم از خوارزمی ج ۲ ص ۱۱۹ طبع دارۃ المعارف ۱۳۳۳ھ)

ابن عساکر کا حوالہ محلی میں موجود ہے، مگر صاحب محلی نے ”کتاب النکاح“ میں خود امام سیوطی کے حوالہ سے اس حدیث کے متعلق یہ نقل کر دیا ہے:

قیل انه رواه عنه أبو حنيفة ولم يصح.

”کہا گیا ہے کہ اس روایت کو امام مالک سے امام ابو حنیفہ نے روایت کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔“

مسند ابو حنیفہ لابن الضیاء کا حوالہ تزئین الممالک میں مذکور ہے مگر صاحب تزئین نے مسند مذکور سے جو حدیث نقل کی ہے وہ کتاب الآثار امام محمد کی ہے اور امام محمد اس کو براہ راست امام مالک سے روایت کرتے ہیں، صاحب مسند نے امام ابو حنیفہ کا نام، اس کی اسناد میں غلطی سے درج کر دیا ہے، مسند ابو حنیفہ لابن الضیاء اصل میں جامع مسانید الامام الاعظم للخوازمی کا اختصار ہے اور جامع مسانید میں یہ روایت کتاب الآثار ہی کے حوالہ سے درج ہے۔

محلی شرح موطا کے مصنف کا نام عبد السلام نہیں بلکہ شیخ سلام اللہ ہے انھوں نے بلاشبہ مواہب کے حوالہ سے اس کو نقل کیا ہے لیکن ساتھ ہی حاشیہ پر یہ تنبیہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ

أما نقل المواهب فمستبعد عن العقل ولا يقبل الذهن لأن أبا حنيفة كان ابن عشرين

سنة، مجتهداً عالماً حين راه مالك ولم يثبت هذا عند أحد غير الدارقطني وإن قال

أن مالكا روى عن أبي حنيفة فجائز. (محلی کا نقلی نسخہ میرے پاس موجود ہے) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسناد و روایت کے اعتبار سے کتاب الآثار کی مرویات کا کیا درجہ ہے اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کی نظر انتخاب نے چالیس ہزار (۱) احادیث کے مجموعہ سے جن کران کو روایت کیا ہے، صدر الامر موفقی بن احمد کی تحریر فرماتے ہیں۔

وانتخب ابو حنیفہ رحمہ اللہ الآثار من أربعین ألف

حدیث (مناقب الامام الاعظم از صدر لا تمدن ج ۱ ص ۹۵)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ”مواہب کی نقل عقل سے بعید ہے اور ذہن اس کو قبول نہیں کرتا، کیونکہ امام مالک نے جس وقت امام ابو حنیفہ کو دیکھا ہے، اس وقت امام ابو حنیفہ کی عمر میں سال کی تھی اور وہ مجتہد اور عالم ہو چکے تھے، نیز مجزدار قطنی کے یہ کسی کے نزدیک ثابت بھی نہیں ہاں اگر صاحب مواہب یہ کہتا کہ امام مالک نے امام ابو حنیفہ سے روایت کی ہے تو یہ ہو سکتا ہے۔“

محدث ناقد علامہ محمد زابد کوثری کا رسالہ اقوم المسالك اس بحث میں قابل دید ہے اور نہایت اہم قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔

(۱) یہ چالیس ہزار متون احادیث کا ذکر نہیں اسانید کا ہے اور جیسا کہ سابق میں گزرا، اس تعداد میں صحابہ کرام کے اقوال اور تابعین کے فتاویٰ بھی داخل ہیں کیونکہ خلف کی اصطلاح میں ان سب کے لئے حدیث اور اثر کا لفظ استعمال ہوتا تھا، امام اعظم کے زمانہ میں احادیث کے طرق واسانید کی تعداد چالیس ہزار سے تجاوز نہ تھی، بعد کو بخاری و مسلم کے عہد میں یہی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی کیونکہ ایک شیخ نے کسی حدیث کو سٹلا دس شاگردوں سے بیان کیا اب وہ محدثین کی اصطلاح میں دس اسانید اور دس طرق ہو گئے، اگر آپ موطا اور کتاب الآثار کی احادیث کی تحریج بقیہ کتب حدیث سے کریں تو ایک ایک متن کے دسیوں بیسیوں طریقے اور اسناد مل جائیں گی۔

اب متون احادیث صحیحہ کی اصل تعداد بھی سن لیجئے، امام ابو حنیفہ رحمہ بن الحسین بغدادی نے کتاب التہذیب میں امام سفیان ثوری، شعبہ، یحییٰ بن سعید القطان، عبد الرحمن بن مہدی اور احمد بن حنبل، ان سب اکابر ائمہ حدیث کا حقیقہ بیان اس سلسلہ میں یہ نقل کیا ہے:

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

”امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کتاب الآثار کا انتخاب چالیس ہزار احادیث سے کیا ہے۔“

اور امام حافظ ابوبکری زکریا بن یحییٰ نیشاپوری المتوفی ۲۹۸ھ جو ابواب صحاح ستہ کے معاصر ہیں، اپنی کتاب مناقب ابی حنیفہ میں خود امام اعظم سے بہ سند نقل کرتے ہیں کہ

عندي صناديق من الحديث ما أخرجت منها، إلا اليسير الذي ينتفع به. (مناقب موفق ج ۱ ص ۱۹۵)

”میرے پاس حدیث کے صندوق بھرے ہوئے موجود ہیں، مگر میں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں نکالی ہیں، جن سے لوگ نفع اندوز ہوں۔“

امام اعظم کی اس احتیاط کا بڑے بڑے محدثین نے اقرار کیا ہے، چنانچہ حافظ ابو محمد عبد اللہ حارثی بسند متصل و کتب سے جو حدیث کے بہت بڑے امام ہیں (۱)

(پچھلے صفحہ کا قیہ) (إن جملة الأحاديث المسندة عن النبي ﷺ يعني الصحيحة لا تحكروا أربعة آلاف وأربع مائة حديث (توضیح الافکار، از امیر یمانی (ص ۶۳ طبع مصر)۔

”ان تمام حدیث صحیحہ غیر مکررہ کی تعداد کہ جو آنحضرت ﷺ سے مسند امر وی ہیں، ”چار ہزار چار سو ہے۔“

ان میں احکام حلال و حرام یعنی احادیث فقہیہ کی تعداد یحییٰ بن سعید القطان اور عبد الرحمن بن مہدی نے آٹھ سو (توضیح الافکار) اور عبد بن المبارک نے نو سو اور امام ابو یوسف نے گیارہ سو بتائی ہے (رسالہ امام ابو داؤد ص ۵۶ و ۵۷ طبع مصر ۱۶۹۹ء) ظاہر ہے کہ امام ابو یوسف چونکہ فقہ اور اجتہاد کے اعتبار سے ان تینوں سے ممتاز ہیں اس لئے اس بارے ان کی تفریح زیادہ قابل قبول ہے۔

(۱) امام احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ ”میں نے کتب سے بڑھ کر علم کا جامع اور حدیث کا حافظ نہیں دیکھا“ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں ”ان سے افضل شخص میری نظر سے نہیں گزرا۔ (تذکرۃ الحفاظ، ترجمہ و کتب)

نقل کرتے ہیں:

أخبرنا القاسم بن عباد سمعت يوسف الصفار يقول سمعت
وكيعاً يقول لقد وجد الورع عن أبي حنيفة في الحديث مالم
يوجد عن غيره (مناقب صدر الأئمة موفق ج ۱ ص ۱۹۷)

”کہ جیسی احتیاط امام ابوحنیفہ سے حدیث میں پائی گئی کسی
دوسرے سے نہ پائی گئی۔“

اسی طرح علی بن الجعد جو ہری سے کہ جو حدیث کے بہت بڑے حافظ (۱)
اور امام بخاری اور ابوداؤد کے استاذ ہیں روایت کرتے ہیں:

قال القاسم بن عباد في حديثه قال علي بن الجعد أبو حنيفة إذا
جاء بالحديث جاء به مثل الدر. (۲)

”امام ابوحنیفہ جب حدیث بیان کرتے ہیں تو موتی کی طرح
آبدار ہوتی ہے۔“

اور حافظ خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں سید الحفاظ یحییٰ بن معین سے
(جن کے متعلق امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے کہ جس حدیث کو یحییٰ بن معین نہ
جائیں وہ حدیث ہی نہیں) بسند متصل ناقل ہیں کہ

كان أبو حنيفة ثقة لا يحدث إلا ما يحفظ ولا يحدث بما لا

(۱) حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے ترجمہ میں عبدوس نیشاپوری اور موسیٰ بن داؤد دونوں کا متفقہ بیان نقل
کیا ہے کہ ان سے بڑھ کر حافظ حدیث ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

(۲) جامع مسانید الأعظم از محدث خوارزمی ج ۲ ص ۳۰۸ طبع دائرة المعارف ۱۳۳۳ھ۔

یـحفظ (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۱۹)

”امام ابو حنیفہ ثقہ ہیں جو حدیث ان کو حفظ ہوتی ہے وہی بیان کرتے ہیں اور جو حفظ نہیں ہوتی بیان نہیں کرتے۔“

اور امام عبداللہ بن المبارک کہ جن کی جلالت شان کا تمام اہل علم کو اعتراف ہے اپنی ایک نظم میں جو انھوں نے امام اعظم کی شان میں لکھی ہے فرماتے ہیں:

روی اثاره فأجاب فيها ☆☆ كطيران الصقور من المنيفة

”انھوں نے آثار کو روایت کیا تو ایسی بلند پروازی دکھائی کہ جیسے

شکاری پرندے بلند مقام پر پرواز کر رہے ہوں“

ولم یک بالعراق له نظیر ☆☆ ولا بالمشرقین ولا بکوفہ (۱)

”سو نہ عراق میں ان کی کوئی نظیر تھی، نہ مشرق و مغرب میں اور

نہ کوفہ میں“

اسی طرح امام اہل سمرقند ابو مقاتل سمرقندی امام اعظم کی مدح کرتے ہوئے کتاب الآثار کے متعلق فرماتے ہیں:

روی الآثار عن نبل ثقات ☆☆ غزار العلم مشیخة حصیفة (۲)

”معززین ثقات سے انھوں نے الآثار کو روایت کیا ہے جو

بڑے وسیع العلم اور عمدہ مشائخ تھے“

حقیقت یہ ہے کہ ان اکابر ائمہ حدیث کی یہ شہادتیں بلاوجہ نہیں ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے کوفہ، بصرہ اور حجاز (۱) کی مشہور درسگاہوں میں علم حدیث کی برسوں تحصیل کی ہے اور جس توجہ اور کوشش سے انھوں نے اس علم کو حاصل کیا ہے، ان کے معاصرین میں سے کم لوگوں نے کیا ہوگا، حافظ ابوسعید سمعانی (۲) کتاب الأئساب میں امام ابوحنیفہؒ کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں:

اشتغل بطلب العلم وبالغ فيه حتى حصل له مالم يحصل
لغيره (طبع لیڈن ورق ۱۹۶)

”وہ طلب علم میں مشغول ہوئے تو اس درجہ غایت انہماک کے ساتھ ہوئے کہ جس قدر علم ان کو حاصل ہوا دوسروں کو نہ ہو سکا“
اور حافظ ذہبیؒ، امام مسعر بن کدّام سے جو عہد طالب علمی میں امام اعظم کے رفیق رہ چکے ہیں، ناقل ہیں:

طلبت مع أبي حنيفة الحديث فغلبننا و أخذنا في الزهد فبرع

(۱) علامہ کمال الدین احمد بیاضی، اشارات المرام من عبارات الإمام (ص ۲۰ طبع مصر ۱۳۶۵ھ) میں فرماتے ہیں: فهو أخذ عن أصحاب عمر عن عمرو عن أصحاب ابن مسعود وعن أصحاب ابن عباس عن ابن عباس ممن يبلغ العدد المذكور، بالكوفة والبصرة والحجاز في حجه ۹۶ھ مست وتسعين وبعده. یعنی امام ابوحنیفہؒ نے اصحاب عمرؓ سے حضرت عمرؓ کا علم اور اصحاب ابن مسعودؓ سے حضرت ابن مسعودؓ کا اور اصحاب ابن عباسؓ سے حضرت ابن عباسؓ کا، مشائخ کی اس تعداد سے جو ذکر کی جا چکی ہے، کوفہ، بصرہ اور حجاز میں رہ کر ۹۶ھ میں بزمانہ حج اور اس کے بعد حاصل کیا ہے۔

(۲) حافظ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں تصریح کی ہے کہ سمعانی تاریخ اور علم حدیث میں ابن جوزی اور ان کے شیخ ابن ناصر دونوں سے بڑھے ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ ترجمہ ابن ناصر)۔

علینا و طلبنا معہ الفقہ فجاء منہ ماترون۔ (۱)

”میں نے امام ابو حنیفہ کے ساتھ حدیث کی تحصیل کی تو وہ ہم پر غالب رہے، اور زہد میں لگے، تو اس میں بھی وہ ہم سے فائق ہو گئے اور فقہ ان کے ساتھ شروع کی تو تم دیکھتے ہی ہو کہ کیسا کمال ان سے ظاہر ہوا۔“

یہ مسعروہی ہیں، جن کو شعبہ ان کے اتقان کی بنا پر مصحف کہا کرتے تھے، (۲) حافظ ابو محمد راہر مزی نے المحدث الفاصل بین الراوی والواعی (۳) میں لکھا ہے کہ شعبہ اور سفیان ثوری میں جب کسی حدیث کی بابت اختلاف ہوتا تو دونوں کہا کرتے اذہبا بنا الی المیزان مسعرو (ہم دونوں کو مسعر کے پاس لے چلو جو اس فن کی میزان ہیں) غور کیجئے شعبہ اور سفیان دونوں ”أمیر المؤمنین فی حدیث“ کہلاتے ہیں اس لئے ان کی میزان علم جس شخص کے متعلق یہ شہادت دے کہ وہ علم حدیث میں ہم سے آگے ہے، وہ خود اس فن میں کس پایہ کا شخص ہوگا، غالباً یہی وجہ ہے کہ شیخ الاسلام حافظ عبدالرحمن مقرئ (جو فن حدیث میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور بخاری کے استاذ ہیں) جب امام ابو حنیفہ سے کوئی حدیث روایت کرتے تھے تو ان الفاظ کے ساتھ کرتے تھے، أخبرنا شاہنشاہ۔ (۴)

اور امام مکی بن ابراہیم فرماتے ہیں:

(۱) مناقب ابی حنیفہ از حافظ ذہبی ص ۷۷ طبع مصر۔ (۲) تذکرۃ الکھاظ ترجمہ مسر۔

(۳) اس کتاب کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن اور کتب خانہ پیر جند وسندھ میں ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ (۴) محدث خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اس کو بہ سند متصل نقل کیا ہے۔

كان أبو حنيفة زاهداً عالماً راغباً في الآخرة صدوق اللسان

أحفظ أهل زمانه (۱)

”امام ابوحنیفہ زاہد، عالم، آخرت کی طرف راغب، بڑے راست باز

اور اپنے اہل زمانہ میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔“

محدث صیمری نے بھی مناقب ابی حنیفہ میں شیخ الاسلام حافظ یزید بن ہارون

سے اسی کے قریب قریب روایت کیا ہے، (۲) اور امام مکی بن سعید القطان جو مشہور

ناقد حدیث اور جرح و تعدیل کے امام ہیں، یوں فرماتے ہیں:

أنه والله لأعلم هذه الأمة بما جاء عن الله ورسوله. (۳)

والله ابوحنیفہ اس امت میں خدا اور اس کے رسول ﷺ سے جو

کچھ وارد ہوا ہے اس کے سب سے بڑے عالم ہیں۔“

ائمہ فن کی اس قدر تصریحات فن حدیث میں امام اعظم کی عظمت شان اور

جلالت مرتبت کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں، اب ذرا اس پر بھی نظر ڈال لیجئے کہ امام اعظم

کے نزدیک کسی حدیث کو روایت کرنے اور اس پر عمل کرنے کے کیا شرائط ہیں، امام

طحاوی نے بہ سند متصل روایت کی ہے۔

حدثنا سليمان بن شعيب حدثنا أبي قال أملاً علينا أبو يوسف

(۱) مناقب الامام الاعظم از صدر الائمہ بحوالہ حافظ ابو احمد عسکری۔

(۲) اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ مجلس علمی کراچی میں موجود ہے، اس کی اصل عبارت یہ ہے: كان أبو حنيفة

تقياً نقياً زاهداً عالماً صدوق اللسان أحفظ أهل زمانه.

(۳) مقدمہ کتاب التعلیم از علامہ مسعود بن شیبہ سندی، بحوالہ امام طحاوی، اس کا قلمی نسخہ مجلس علمی کے کتب

خانہ میں موجود ہے۔

قال: قال أبو حنيفة لا ينبغي للرجل أن يحدث من الحديث إلا بما حفظه من يوم سمعه إلى يوم يحدث به

(الجواهر المضية، ترجمة الامام أبي حنيفة)

”کہ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کسی شخص کو اس وقت تک حدیث نہیں بیان کرنا چاہئے جب تک کہ سننے کے دن سے لیکر بیان کرنے کے دن تک اسی طرح یاد نہ ہو۔“

امام یحییٰ بن معین کی تصریح ابھی آپ پڑھ چکے کہ روایت حدیث کے باب میں امام صاحب کا عمل اسی اصول پر تھا، بعد کے متعدد محدثین نے حفظ کی بجائے کتابت کو کافی سمجھا، اس لئے ان کے خیال میں اگر راوی کو حدیثوں کے الفاظ و معانی کچھ بھی یاد نہ ہوں، تاہم چونکہ وہ قلمبند صورت میں اس کے پاس موجود ہیں اس لئے ان کو روایت کر سکتا ہے، چنانچہ محدث خطیب بغدادی، الکفایہ فی علم الروایہ میں لکھتے ہیں:

”ابوزکریا یعنی یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنے قلم سے حدیث لکھی ہوئی پائے مگر وہ اس کو زبانی یاد نہ ہو تو کیا کرے؟ کہنے لگے ابوحنیفہ تو یوں فرماتے ہیں کہ جس حدیث کا انسان عارف اور حافظ نہ ہو، اسے بیان نہ کرے، لیکن ہم یوں کہتے ہیں کہ اپنی کتاب میں جو کچھ اپنے قلم سے لکھا ہو پائے اسے بیان کر سکتا ہے، چاہے وہ اس روایت کا عارف ہو یا نہ ہو۔“ (۱)

اور حافظ سیوطی، تدریب الراوی میں امام ابوحنیفہ کا مذہب نقل کر کے لکھتے ہیں:

(۱) الکفایہ فی علم الروایہ ص ۲۳۱، طبع دارۃ المعارف، حیدرآباد، دکن ۱۳۵۷ھ۔

وهذا مذهب شديد وقد استقر العمل على خلافه فلعل الرواة
في الصحيحين ممن يوصف بالحفظ لا يبلغون النصف. (۱)
”یہ سخت مذہب ہے اور عمل اس کے خلاف قرار پایا ہے، کیونکہ
غالباً صحیحین کے ان رواۃ کی تعداد جو حفظ سے موصوف ہیں،
نصف تک نہیں پہنچتی۔“

اگرچہ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ اختلاف عصر و زمان کا مسئلہ ہے اسی لئے
امام مالک بھی اس مسئلہ میں امام اعظم کے ہم زبان ہیں، اس عہد تک کتابت سے
زیادہ حفظ پر زور تھا، بعد کو جس قدر زمانہ گزرتا گیا حفظ کی جگہ کتابت نے لے لی،
تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حافظ حدیث کی روایت کو غیر حافظ کی روایت پر
ترجیح ہے کیونکہ عدم حفظ کی صورت میں احتمال ہے کہ کوئی خط میں خط ملا کر نوشتہ میں
گڑبڑ نہ کر دے، بہر حال اس حیثیت سے کتاب الآثار اور مؤطا کی مرویات کو
صحیحین کی مرویات پر جو ترجیح حاصل ہے ظاہر ہے۔

اور امام ربانی علامہ عبدالوہاب شعرائی، المیزان الکبریٰ میں رقمطراز ہیں:

وقد كان الإمام أبو حنيفة يشترط في الحديث المنقول عن
رسول الله ﷺ قبل العمل به أن يرويه عن ذلك الصحابي
جمع أتقياء عن مثلهم وهكذا. (۲)

”جو حدیث آنحضرت ﷺ سے منقول ہو اس کی بابت امام

(۱) تدریب الراوی ص ۱۶۰۔

(۲) میزان شعرائی ج ۱ ص ۶۲ طبع مصر ۱۳۳۳ھ۔

ابو حنیفہ عمل سے پہلے یہ شرط کرتے ہیں کہ اس کو متقی لوگوں کی

ایک جماعت اس صحابی سے برابر نقل کرتی چلی آئے۔“

امام شعرانی نے عمل بالحدیث کے لئے امام ابو حنیفہ کی جس شرط کا ذکر کیا ہے

وہ خود امام ممدوح سے بصراحت منقول ہے، چنانچہ حافظ ذہبی نے امام یحییٰ بن معین کی

سند سے امام صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

اخذ بكتاب الله فمالم أجد فبسنة رسول الله والأثار الصحاح

عنه التي فشئت في أيدي الثقات عن الثقات فإن لم أجد فبقول

أصحابه اخذ بقول من شئت وأما إذا انتهت الأمر إلى إبراهيم

والشعبي والحسن وعطاء فأجتهد كما اجتهدوا (۱)

”میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ

ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کی ان صحیح حدیثوں سے کہ جو

ثقات کے ہاتھوں میں ثقات ہی کے ذریعہ شائع ہوئی ہیں، پھر

اگر یہاں بھی نہ مل سکے، تو آپ ﷺ کے اصحاب میں سے

جس کا قول چاہتا ہوں اختیار کر لیتا ہوں لیکن جب معاملہ ابراہیم

نخعی، شعبی، حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح تک آجاتا ہے تو

جس طرح ان حضرات نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔“

امام ابو حنیفہ کا یہ بیان خاص طور پر قابل غور ہے، اس میں آپ نے اپنے

طریق استنباط کی توضیح فرمائی ہے اور احادیث کے بارے میں صراحت کی ہے کہ آپ

صرف ان ہی حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں کہ جو صحیح ہیں اور ثقات کے ذریعہ جن کی اشاعت ہوئی ہے، امام سفیان ثوری نے بھی حدیث کے متعلق امام صاحب کا یہی طرز عمل بتلایا ہے کہ

ياخذ بماصح عنده من الأحاديث التي كان يحملها الثقات

وبالآخر من فعل رسول الله ﷺ. (۱)

”جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور ثقات جن کو

روایت کرتے ہیں، نیز جو آنحضرت ﷺ کا آخری فعل ہوتا

ہے یہ اسی کو لیتے ہیں۔“

غرض کتاب الآثار، قرآن پاک کے بعد کتب خانہ اسلام کی دوسری کتاب

ہے، جو ابواب پر مرتب و مدون ہوئی اور جس میں صرف ان ہی احادیث اور آثار

و فتاویٰ نے جگہ پائی کہ جن کی روایت ثقات و ائمہ امت میں برابر چلی آتی تھی، امام

اعظم نے اس کتاب میں آنحضرت ﷺ کے آخری افعال اور ہدایات کو منبأ اول،

اور آثار و فتاویٰ صحابہ و تابعین کو منبأ ثانی قرار دیا۔

کتاب الآثار کا موضوع صرف احادیث احکام یعنی سنن ہیں، جن سے

مسائل فقہ کا استنباط ہوتا ہے، اس لئے وہ سیکڑوں مختلف ابواب جو صحیحین اور جامع ترمذی

وغیرہ دیگر کتب احادیث میں مذکور ہیں، کتاب الآثار میں نہیں ملیں گے کیونکہ ان ابواب

کا تعلق فقہیات سے نہیں ہے، اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں کتاب الآثار، کتب سنن

میں داخل ہے، چنانچہ بعض محدثین نے اسی نام سے کتاب کا ذکر کیا ہے۔

کتاب الآثار کا ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اس کی مرویات اس عہد کی دیگر تصانیف کی طرح اپنے ہی شہر اور اقلیم کی روایات میں محدود و منحصر نہیں، بلکہ اس میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ غرض کہ جاز و عراق دونوں جگہ کا علم تحریر و تدوین میں یکجا موجود ہے۔

حافظ ابن القیم، اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں:

والدين والفقهاء والعلماء انتشر في الأمة عن أصحاب ابن مسعود وأصحاب زيد بن ثابت وأصحاب عبد الله بن عمر وأصحاب عبد الله بن عباس، فعلم الناس عامة عن أصحاب هؤلاء، إلا أربعة، فأما أهل المدينة فعلمهم عن أصحاب زيد ابن ثابت وعبد الله بن عمر وأما أهل مكة فعلمهم عن أصحاب عبد الله بن عباس وأما أهل العراق فعلمهم عن أصحاب عبد الله بن مسعود. (۱)

”دین اور فقہ و علم کی اشاعت امت میں اصحاب عبد اللہ بن مسعودؓ، اصحاب زید بن ثابتؓ، اصحاب عبد اللہ بن عمرؓ اور اصحاب عبد اللہ بن عباسؓ سے ہوئی ہے، اور لوگوں کا عام علم ان ہی چار کے اصحاب سے لیا ہوا ہے، چنانچہ مدینہ والوں کا علم زید بن ثابتؓ اور عبد اللہ بن عمرؓ کے اصحاب سے اور مکہ والوں کا علم عبد اللہ بن عباسؓ کے اصحاب سے اور عراق والوں کا علم عبد اللہ بن مسعودؓ کے اصحاب سے لیا ہوا ہے۔“

امام مالک نے مؤطا کی تالیف مدینہ منورہ میں کی ہے اور اس میں مدنی شیوخ کے علاوہ اور لوگوں سے برائے نام روایتیں ہیں، لیکن کتاب الآثار کے رواۃ میں کوئی یاعراقی کی تخصیص نہیں، بلکہ حجاز، عراق، اور شام جملہ بلاد اسلامیہ کے علماء سے اس میں روایتیں موجود ہیں، ہم نے کتاب الآثار بروایت امام محمد سے جس میں دوسرے ائمہ کے نسخوں کی بہ نسبت کم روایتیں ہیں امام اعظم کے شیوخ کو جمع کیا تو ایک سو پانچ ہوئے، پھر ان کے اوطان پر نظر ڈالی تو تیس کے قریب ایسے مشائخ حدیث نکلے جو کوفہ کے رہنے والے نہ تھے۔

صحابہ میں جن بزرگوں سے مسائل فقہ و فتاویٰ منقول ہیں ان کی تعداد کچھ اوپر ایک سو تیس ہے (۱) ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں، فتوے کے بارے میں بعض صحابہ منکثر تھے، بعض متوسط اور بعض مقل، جو سب سے زیادہ کثیر الفتوے تھے وہ یہ حضرات ہیں، عمر بن الخطاب، علی مرتضیٰ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، ام المؤمنین عائشہ صدیقہ، زید بن ثابت، اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، ان سات میں بھی اول الذکر چار بزرگ زیادہ ممتاز گزرے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں ”وأكابر هذا الوجه عمر وعلي وابن مسعود وابن عباس“۔ (۲)

مؤطا میں امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور حضرت عبداللہ بن

(۱) حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المفضیۃ کے خاتمہ میں اور حافظ ابن القیم نے اعلام المتوہین کے مقدمہ میں ان سب کو نام ذکر کیا ہے۔

(۲) حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۳۲، طبع منیریہ مصر ۱۳۵۲ھ۔

عباسؓ سے بہت کم روایات ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب مصنفی شرح مؤطا کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

وامام مالک از حضرت مرتضیٰ و عبد اللہ بن عباس کم روایت کردہ است و ہارون رشید از سبب آن استفسار کرد، فرمود ”لم یكونا ببلدي ولم ألق رجالهما“ یعنی نہ بودند در شہر من و ملاقات نہ کردم با یاران ایشان۔ (۱)
 ”امام مالک نے حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) سے کم روایتیں کی ہیں، ہارون رشید نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ لم یكونا ببلدي ولم ألق رجالهما یعنی یہ دونوں بزرگ میرے شہر کے نہ تھے اور میری ان اصحاب سے ملاقات نہ ہو سکی۔“

خاکسار کہتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایتیں مؤطا میں ان دونوں حضرات کی روایات سے بھی کم ہیں، برخلاف اس کے کتاب الآثار میں جس مقدار میں حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایتیں ہیں، اسی کے قریب قریب حضرت عمر، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایات بھی ہیں۔

امت مرحومہ کا سواد اعظم جس کی تعداد کا اندازہ نصف یا دوثلث اہل اسلام کیا گیا ہے، بارہ سو سال سے فقہ میں جس مذہب کا پیرو ہے وہ مذہب حنفی ہے، اس مذہب کے مسائل فقہ کا مبنی اسی کتاب الآثار کی احادیث و روایات ہیں، شاہ ولی اللہ

صاحب نے قرۃ العینین فی تفصیل الشیخین میں کتاب الآثار کو حنفیوں کی امہات کتب میں شمار کیا ہے (۱) اور تصریح کی ہے کہ

مسند ابی حنیفہ و آثار محمد بنائے فقہ حنفیہ است (۲)

”فقہ حنفی کی بنیاد مسند ابی حنیفہ اور آثار امام محمد پر ہے۔“

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہندوستان میں علم حدیث کا چرچا دوسرے ممالک کی بہ نسبت کم رہا ہے، اس لئے یہاں کے بعض مصنفین کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ حدیث میں امام ابو حنیفہ کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے، چنانچہ ملا حیون المتونی ۱۱۳۰ھ نور الانوار میں لکھتے ہیں:

لم یجمع أبو حنیفہ کتاباً فی الحدیث (۳)

”ابو حنیفہ نے حدیث میں کوئی کتاب مدون نہیں فرمائی“

اور شاہ ولی اللہ صاحب مصنفی شرح مؤطا کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

واذا ائمہ فقہ امروز ہیچ کتابے خود ایشان تصنیف کردہ باشند بدست مردمان

نیست الا مؤطا۔

”اور آج ائمہ فقہ کی کوئی کتاب کہ جس کو خود انھوں نے تصنیف کیا

ہو، سوائے مؤطا کے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔“

شاہ عبدالعزیز صاحب بھی بستان الحمد شین میں اپنے والد ماجد کی پیروی

(۱) ملاحظہ ہو، کتاب مذکور ص ۱۸۵، طبع مجتہائی ۱۳۱۰ھ۔ (۲) ایضاً ص ۱۷۱۔

(۳) نور الانوار، طبع علوی، بکھنوس ۱۶۰۔

میں یہی لکھتے ہیں کہ

باید دانست کہ از تصانیف ائمہ اربعہ رحمہم اللہ در علم حدیث غیر از مؤطا
موجود نیست۔ (۱)

”جاننا چاہئے کہ ائمہ اربعہ کی تصانیف میں سے علم حدیث
میں بجز مؤطا کے اور کوئی تصنیف موجود نہیں ہے۔“

مولانا شبلی نعمانی نے بھی اس بارے میں شاہ ولی اللہ صاحب ہی کے فیصلے کو
کافی سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں:

”بے شبہ ہماری ذاتی رائے یہی ہے کہ آج امام صاحب کی کوئی
تصنیف موجود نہیں ہے۔“ (۲)

اور ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی بھی یہی لکھ رہے ہیں کہ
”امام مالک کے سوا کسی امام مجتہد کے قلم سے علم حدیث کی کوئی
تصنیف ظاہر نہیں ہوئی۔“ (۳)

ملا جیون محدث نہ تھے اس لئے ان کا انکار محل تعجب نہیں، شاہ ولی اللہ
صاحب کتاب الآثار سے بخوبی واقف ہیں، انھوں نے شیخ تاج الدین قلعی حنفی مفتی
مکہ مکرمہ سے اس کے اطراف کا سماع بھی کیا ہے، چنانچہ انسان العین فی مشائخ
المحرین میں ان کے تذکرہ میں فرماتے ہیں:

”واطراف۔۔۔۔۔ کتاب الآثار امام محمد وموطائے ادازوے سماع نمود“ (۴)

(۱) بستان الحدیث، ص ۲۸۲ طبع محمدی، لاہور۔ (۲) سیرۃ اعمان، ص ۱۱۹، طبع مفید عام، آگرہ ۱۸۸۲ء
(۳) حیات امام مالک، ص ۹۰، طبع معارف، اعظم گڑھ ۱۳۳۰ھ۔ (۴) انسان العین ص ۱۶ طبع احمدی دہلی۔

شاہ صاحب ممدوح کو یہ بھی معلوم ہے کہ امام محمد اس کتاب کو امام ابو حنیفہ سے روایت کرتے ہیں، چنانچہ مصنفی میں خود ان کے الفاظ ہیں:

”آثار یکہ از امام ابو حنیفہ روایت کردہ است“ (۱)

مگر شاید وہ اس کو امام ابو حنیفہ کی بجائے امام محمد کی تصنیف سمجھتے ہیں، محدث ملا علی قاری نے خود مؤطا امام محمد کے متعلق بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ امام محمد نے ان دونوں کتابوں کو ان کے مصنفین سے جس انداز پر روایت کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی غلط فہمی کا پیدا ہو جانا کچھ زیادہ محل تعجب نہیں، امام موصوف کا ان دونوں کتابوں میں طرز عمل یہ ہے کہ وہ ہر باب میں اولاً اس کتاب کی روایتیں نقل کرتے ہیں، پھر بالالتزام ان روایات کے متعلق اپنا اور اپنے استاد امام ابو حنیفہ کا مذہب بیان کرتے ہیں اور اگر اصل کتاب کی کسی روایت پر ان کا عمل نہیں ہوتا، تو اس کو نقل کرنے کے بعد اس پر عمل نہ کرنے کے وجوہ و دلائل بالتفصیل لکھتے ہیں، اور اسی ذیل میں کتاب الآثار اور مؤطا دونوں کتابوں میں بہت سی حدیثیں اور آثار، امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے علاوہ دیگر شیوخ سے بھی منقول ہیں، اس بنا پر بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں خود امام محمد ہی کی تصنیف کردہ ہیں (۲) حالانکہ

(۱) مصنفی ص ۸ (۲) مولانا شبلی نعمانی کتاب الآثار کے متعلق اور ملا علی قاری نے مؤطا کے متعلق اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر آپ کو اس غلط فہمی کی وجہ خود معلوم ہو جائے گی، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

”خواری نے آثار امام محمد کو بھی امام کی مسانید میں داخل کیا ہے، بے شہر اس کتاب میں

اکثر روایتیں امام صاحب ہی سے ہیں اس لئے ناظرین کو اختیار ہے کہ اس کو امام ابو حنیفہ کا

مسند کہیں یا آثار امام محمد کے نام سے پکاریں، لیکن یاد رہے کہ امام محمد نے اس کتاب میں

بہت سے آثار اور حدیثیں دوسرے شیوخ سے بھی روایت کی ہیں، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

واقع میں ایسا نہیں بلکہ کتاب الآثار، امام ابو حنیفہ کی اور مؤطا، امام مالک کی تصنیف ہے، اور امام محمد ان دونوں حضرات سے ان کے راوی ہیں، لیکن چونکہ امام مہدوح نے ان کتابوں کی روایت میں امور مذکورہ بالا کا اہتمام رکھا ہے اس بنا پر ان کی افادیت زیادہ بڑھ گئی اور ان کا تداول اس درجہ عام ہو گیا کہ بجائے اصل مصنف کے خود ان کی طرف کتاب کا انتساب ہونے لگا اور کتاب الآثار امام محمد اور مؤطا امام محمد کہا جانے لگا، اس لئے ان حضرات کو بھی غلط فہمی ہو گئی، جس کی اصل وجہ ان دونوں کتابوں کے بقیہ نسخوں پر عدم اطلاع ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اس لحاظ سے اس مجموعہ کا انتساب امام محمد کی طرف زیادہ موزوں ہے۔“ (سیرۃ العمان ص ۲۷)
اور ملا علی قاری، مؤطا امام محمد کی شرح میں لکھتے ہیں:

وقد وجدت بخط استاذي المرحوم الشيخ عبد الله السندي في ظهر هذا الكتاب انه مؤطا مالک بن انس برواية محمد بن الحسن وهو مشكل لا يروي الإمام محمد فيه من غير الإمام مالک أيضاً كإمام أبي حنيفة وأمثاله ولعله نظر إلى الأغلب.

”میں نے اپنے استاذ مرحوم شیخ عبد اللہ سندھی کے قلم سے اس کتاب کی پشت پر یہ لکھا ہوا پایا کہ یہ مؤطا مالک بن انس بروایت محمد بن الحسن ہے، اور یہ مشکل ہے کیونکہ امام محمد اس کتاب میں امام مالک کے علاوہ دیگر شیوخ سے بھی جیسے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے امثال ہیں روایت کرتے ہیں اور شاید استاذ مرحوم کا یہ فرمانا اس کی اغلب روایات کے اعتبار سے ہو۔“

ملا علی قاری کی شرح مؤطا محمد کے قلمی نسخے ہندو پاکستان کے متعدد کتب خانوں میں ہماری نظر سے گزرے ہیں، ملاحظہ فرمایا آپ نے مولانا شبلی نعمانی کو جو اشکال کتاب الآثار امام محمد کے امام ابو حنیفہ کی طرف انتساب میں ہے وہی اشکال ملا علی قاری کو مؤطا امام محمد کے امام مالک کی طرف منسوب کرنے میں ہے۔

کتاب الآثار کے نسخے

موطا اور دیگر کتب حدیث کی طرح اس کتاب کے بھی متعدد نسخے ہیں، جس کے راوی حسب ذیل حضرات ہیں:

(۱) امام زفر بن الہذیل

ان کے نسخہ کا ذکر حافظ امیر بن ماکولا المتوفی ۵۷۵ھ نے الاکمال کے ”باب الجصینی والحصینی“ میں کیا ہے، چنانچہ احمد بن حنبل کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

أحمد بن بكر بن سيف أبو بكر الجصيني ثقة يميل ميل أهل النظر، روى عن أبي وهب عن زفر بن الهذيل عن أبي حنيفة (كتاب الآثار)

”احمد بن بکر سیف ابو بکر جصینی ثقہ ہیں اہل نظر یعنی فقہاء حنفیہ کی طرف میلان رکھتے ہیں اور امام ابو حنیفہ سے کتاب الآثار کو بواسطہ امام زفر بن الہذیل ان کے شاگرد ابو وہب سے روایت کرتے ہیں۔“

الاکمال ابن ماکولا کا قلمی نسخہ ریاست ٹونک اور کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں ہماری نظر سے گزرا ہے، مطبوعہ کتابوں میں بعینہ یہی مضمون حافظ ابوسعد سمعانی شافعی کی کتاب الانساب میں جولانڈن یورپ میں طبع ہو چکی ہے، جصینی نسبت کے ضمن میں مذکور ہے اور حافظ عبدالقادر قرشی نے بھی ”الجواهر المضية في طبقات الحنفية“ میں احمد بن بکر مذکور کے ترجمہ

میں یہی تحریر کیا ہے۔

امام زفر سے کتاب الآثار کی روایت ان کے تین شاگردوں نے کی ہے جنہوں نے اس کا امام ممدوح سے علیحدہ علیحدہ سماع کیا تھا، ایک یہی ابو وہب محمد بن مزاحم مروزی، دوسرے شداد بن حکیم بلخی جن کے نسخہ سے جامع مسانید الإمام الأعظم للخوازمی میں مسند ابن خسر وغیرہ کے حوالہ سے بکثرت روایتیں منقول ہیں اور تیسرے حکم بن ایوب، پہلے دونوں کا ذکر محدث حاکم نیشاپوری نے بھی اپنی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں بایں الفاظ کیا ہے:

نسخة لزفر بن الهذيل الجعفي تفرد بها عنه شداد بن حكيم
البلخي ونسخة أيضاً لزفر بن الهذيل الجعفي تفرد بها أبو وهب
محمد بن مزاحم المروزي (۱)

”زفر بن الہذیل جعفی کا ایک نسخہ ہے، جس کو ان سے صرف
شداد بن حکیم بلخی روایت کرتے ہیں اور زفر بنی کا ایک اور نسخہ
ہے، جس کو ان سے صرف ابو وہب محمد بن مزاحم مروزی
روایت کرتے ہیں۔“

تیسرے نسخہ کا ذکر حافظ ابوالشیخ بن حیان نے اپنی کتاب طبقات
المحدثین (۲) بأصبهان والواردین علیہا میں احمد بن رستہ کے ترجمہ میں کیا
ہے، چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:

(۱) معرفۃ علوم الحدیث، ص ۱۶۴، طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۳۵ھ۔

(۲) اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں میری نظر سے گذرا ہے۔

أحمد بن رستہ بن بنت محمد بن المغيرة، كان عنده السنن

عن محمد عن الحكم بن أيوب عن زفر عن أبي حنيفة.

”احمد بن رستہ جو محمد بن المغیرہ کے نواسے ہیں، ان کے پاس

سنن تھی، جس کو وہ اپنے نانا محمد سے، وہ حکم بن ایوب سے، وہ

زفر سے اور وہ امام ابوحنیفہ سے اس کو روایت کرتے تھے۔“

حافظ ابوالشیخ نے یہاں کتاب الآثار کو السنن کے نام سے ذکر کیا ہے اور

چونکہ وہ ہر راوی کے ترجمہ میں اس کی روایت سے ایک دو حدیثیں بھی ذکر کرتے ہیں،

اس لئے دو حدیثیں اس نسخہ سے بھی اپنی کتاب میں درج کی ہیں، اسی طرح حافظ

ابو نعیم اصفہانی نے بھی تاریخ اصفہان میں اس نسخہ کی روایتیں نقل کی ہیں، امام طبرانی

کی المعجم الصغیر (ص ۳۳) میں بھی اس نسخہ کی ایک حدیث مروی ہے۔

(۲) امام ابویوسف

ان کے نسخہ کا ذکر حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المصیۃ میں کیا ہے چنانچہ

امام یوسف بن ابی یوسف کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

روی ”كتاب الآثار“ عن أبيه عن أبي حنيفة وهو مجلد ضخم.

”یہ اپنے والد کی سند سے امام ابوحنیفہ سے کتاب الآثار کی

روایت کرتے ہیں جو ایک ضخیم جلد میں ہے۔“

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا ابوالوفا قدسہاری صدر مجلس احیاء

المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن کو کہ انھوں نے بڑی تلاش اور محنت سے اس نسخہ کو

فراہم کر کے تصحیح و ترمیم کے اہتمام کے ساتھ نہایت عمدہ کاغذ پر ۱۳۵۵ھ میں اسے مصر میں طبع کرا کر شائع کیا۔

امام ابو یوسف سے بھی کتاب الآثار کے اس نسخہ کو دو شخص روایت کرتے ہیں، ایک ان کے صاحبزادے امام یوسف مذکور اور دوسرے عمرو بن ابی عمرو، محدث خوارزمی نے عمرو کی روایت کو جامع مسنید میں نسخہ ابی یوسف سے موسوم کیا ہے، خوارزمی نے جامع مسنید کے باب ثانی میں اس نسخہ کی اسناد بھی امام ابو یوسف تک نقل کر دی ہے۔

(۳) امام محمد بن حسن شیبانی

ان کا نسخہ، کتاب الآثار کے سب نسخوں میں زیادہ متداول، زیادہ مشہور اور زیادہ مقبول ہے، اسی کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی، تعجیل المنفعة بزوائد رجال الأربعة کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

والموجود من حديث أبي حنيفة مفرداً إنما هو "كتاب الآثار"

التي رواها محمد بن الحسن عنه.

”امام ابو حنیفہ کی حدیث میں مستقل طور پر جو کتاب موجود ہے

وہ کتاب الآثار ہے، جس کو امام محمد بن الحسن نے ان سے

روایت کیا ہے“

حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ قاسم بن قطلوبغا نے اس کے رجال پر

مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، حافظ ابن حجر کی کتاب کا نام الإیضار بمعرفة رواة

الآثار ہے، اس کا قلمی نسخہ میرے پاس بھی موجود ہے، صاحب کشف الظنون نے

لکھا ہے کہ کتاب الآثار امام محمد پر امام طحاوی نے شرح لکھی ہے، علامہ مراوتی نے بھی مسلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر میں شیخ ابو الفضل نور الدین علی بن مراد موصلی عمری شافعی التوفی ۱۱۴ھ کے ترجمہ میں ان کی شرح کتاب الآثار امام محمد کا ذکر کیا ہے، خود ہم نے بھی اس کے رجال پر مستقل کتاب لکھی ہے اور اس نسخہ کی احادیث کو مسانید صحابہ پر مرتب کیا ہے اور اگر اللہ نے توفیق دی تو اس پر ایک مبسوط اور محققانہ شرح لکھنے کا ارادہ ہے۔

امام محمد سے بھی اس نسخہ کو ان کے کئی شاگردوں نے روایت کیا ہے، مطبوعہ نسخہ امام ابو حفص کبیر اور امام ابوسلیمان جوز جاتی کا روایت کردہ ہے، ان دونوں حضرات کے علاوہ امام ممدوح کے ایک اور شاگرد عمرو بن ابی عمرو بھی ان سے اس کتاب کو روایت کرتے ہیں اور خوارزمی نے جامع مسانید میں اسی کو نسخہ امام محمد سے موسوم کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخہ میں عمرو نے صرف حدیثیں ہی روایت کی ہیں اور فتاویٰ تابعین کو نقل نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لئے اس کو مسند ابی حنیفہ کہا جاتا ہے۔

(۴) امام حسن بن زیاد لؤلؤی

ان کے نسخہ کا ذکر حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں کیا ہے، چنانچہ محمد بن ابراہیم بن حبیش بغوی کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

محمد بن ابراہیم بن حُبَيْش البغوي روى عن محمد بن

شجاع الثلجي عن الحسن بن زياد عن أبي حنيفة

”کتاب الآثار“۔ (۱)

”محمد بن ابراہیم بن حیش بغوی، محمد بن شجاع ثلجی سے وہ حسن بن زیاد سے اور وہ امام ابو حنیفہ سے کتاب الآثار کو روایت کرتے ہیں۔“

کتاب الآثار کے تمام نسخوں میں یہ نسخہ غالباً سب سے بڑا ہے کیونکہ امام حسن بن زیاد نے امام ابو حنیفہ کی احادیث مرویہ کی تعداد چار ہزار بیان کی ہے، چنانچہ امام حافظ ابویحییٰ زکریا بن یحییٰ نیشاپوری اپنی اسناد کے ساتھ امام لؤلؤئی سے ناقل ہیں کہ

کان أبو حنیفۃ یروی أربعة الاف حدیث، ألفین لحمداد و ألفین

لسائر المشیخة۔ (۲)

(۱) واضح رہے کہ لسان المیزان کے مطبوعہ نسخہ میں یہ عبارت اس طرح مرقوم ہے: محمد بن ابراہیم بن حسن ابوغوی روى عن محمد بن یحییٰ الثعلبی عن الحسن بن زیاد عن محمد بن الحسن عن ابی حنیفہ کتاب الآثار، لیکن اس میں اسماء کے اندر بڑی قسیف ہو گئی ہے ”ابن حیش ابوغوی“ کی بجائے حسن ابوغوی غلط چھپ گیا ہے اور ”ابن شجاع الثلجی“ کی جگہ ”بن یحییٰ“ طبع ہو گیا ہے۔ اسی طرح ”عن الحسن بن زیاد عن ابی حنیفہ“ کے درمیان ”عن محمد الحسن“ کا اضافہ اگر اصل منقول عنہ میں موجود ہے تو یقیناً غلط ہے۔

بہر حال مطبع کے محققین نے یہاں تک تصحیح کا اہتمام نہیں کیا، قلمی نوشتوں کے پڑھنے میں اسماء کی غلطی تو بالکل معمولی بات ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ نہایت بدخط تھے خود ہم نے حافظ صاحب کے قلم کا لکھا ہوا اتحاف المبرہہ کا نسخہ دیکھا ہے واقعی ان کے نوشتہ کو صحیح پڑھ لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے، محمد بن ابراہیم بن حیش ابوغوی اور امام محمد بن شجاع الثلجی دونوں نہایت مشہور و معروف عالم ہیں، حافظ خطیب بغدادی نے ان دونوں کا مفصل تذکرہ تاریخ بغداد میں لکھا ہے اور چونکہ یہ دونوں حنفی ہیں اس لئے وہ اپنی عادت کے مطابق ان دونوں کے خلاف تعصب کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔

(۲) مناقب الامام الاعظم از صدر الائمہ ج ۱ ص ۹۶۔

”امام ابو حنیفہ چار ہزار احادیث روایت فرماتے تھے، دو ہزار حماد سے اور دو ہزار باقی مشائخ سے“

اس بنا پر قیاس یہی ہے کہ امام لؤلؤؒ نے امام اعظم سے یہ سب حدیثیں سنی ہو گئی اور ان کو اپنے نسخہ میں روایت کیا ہوگا، محدث علی بن عبدالحسن دوالیسی حنبلی نے اپنے ثبت میں اس نسخہ سے ساٹھ حدیثیں نقل کی ہیں، جن کو محدث کوثری نے الإمتاع بسيرة الإمامين الحسن بن زياد و صاحبه محمد بن شجاع میں نقل کر دیا ہے۔

محدث خوارزمی نے جامع مسانید میں اس نسخہ کو مسند أبي حنيفة للحسن بن زياد سے موسوم کیا ہے اور کتاب مذکور کے باب ثانی میں اس نسخہ کی اسناد بھی امام لؤلؤؒ تک نقل کر دی ہے، خوارزمی کی طرح دیگر محدثین بھی اس کو مسند ابی حنیفہ ہی کے نام سے روایت کرتے ہیں، خود حافظ ابن حجر عسقلانی کی مرویات میں بھی یہ نسخہ موجود تھا، اس نسخہ کی اسانید و اجازات کو محدث علی بن عبدالحسن الدوالیسی الحنبلی نے اپنے ثبت میں اور حافظ ابن طولون نے الفهرست الأوسط میں اور حافظ محمد بن یوسف دمشقی مصنف سيرة شاميه نے عقود الجمان میں اور محدث ایوب خلوتی نے اپنے ثبت میں اور خاتمة الحفاظ ملا محمد عابد سندى نے حصر الشارذ في أسانيد الشيخ محمد عابد میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور علامہ محدث محمد زاہد کوثری نے ان سب کو الامتاع میں جمع کر دیا ہے جو ۱۳۶۸ھ میں مصر سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

حافظ ابن القیم کی اعلام الموقعین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ

ان کے بھی پیش نظر تھا چنانچہ انھوں نے اس نسخہ سے حسب ذیل حدیث نقل کی ہے۔

قال الحسن بن زياد اللؤلؤي ثنا أبو حنيفة قال كنا عند

محارب بن دثار..... وكان متكئاً فاستوى جالساً ثم

قال سمعت ابن عمر يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول:

”ليأتين على الناس يوم تشيب فيه الولدان وتضع الحوامل

ما في بطونهن“ (الحدیث) (۱)

ان حضرات کے علاوہ اور بھی بہت سے ائمہ نے امام اعظم سے کتاب

الآثار کو روایت کیا ہے، جن میں سے امام ممدوح کے صاحبزادے حماد بن ابی

حنيفة اور محمد بن خالد وہابی کے نسخوں سے جامع مسانید میں بھی حدیثیں

منقول ہیں، خوارزمی نے ان دونوں نسخوں کا ذکر مسند ابی حنیفہ کے نام سے کیا ہے اور

کتاب مذکور کے باب ثانی میں اپنی اسناد بھی ان دونوں حضرات تک نقل کر دی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ خوارزمی نے چونکہ ان نسخوں کو مسند کہا ہے، اس لئے

بعد کے اکثر مصنفین بھی ان کو مسند ہی کے نام سے ذکر کرنے لگے، متقدمین میں

دستور تھا کہ وہ ایک کتاب کو متعدد ناموں سے موسوم کرتے تھے، مثلاً دارمی کی تصنیف

کو مسند دارمی بھی کہتے ہیں اور سنن دارمی بھی، یا ترمذی کی کتاب سنن بھی کہلاتی ہے

اور جامع بھی، اسی طرح کتاب الآثار کے ان نسخوں کو کبھی علماء نے مسند کے نام سے

ذکر کیا ہے اور کبھی سنن کے نام سے، اور کبھی کتاب الآثار کے نام سے اور کبھی صرف

نسخہ ہی لکھ دیا ہے، لیکن اس مجموعہ کا اصل نام کتاب الآثار ہی ہے، چنانچہ ملک العلماء

امام علاء الدین کاسائی نے بھی بدائع الصنائع میں اس کتاب کا ذکر اثار اہی حنیفہ ہی کے نام سے کیا ہے۔ (۱)

موطا

کتاب الآثار کے بعد حدیث کا دوسرا صحیح مجموعہ (۲) جو اس وقت امت کے ہاتھوں میں موجود ہے وہ امام دارالہجۃ مالک بن انس کی مشہور تصنیف موطا ہے جو اہل مدینہ کی روایات و فتاویٰ کا بہترین انتخاب ہے، سابق میں گزر چکا ہے کہ امام مالک نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں امام ابوحنیفہ کا تتبع کیا ہے، چنانچہ

(۱) بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۱ ص ۲۲۰ طبع مصر

(۲) اور حیات امام مالک میں جو یہ مرقوم ہے کہ

”موطا کو سب سے بڑا شرف یہ حاصل ہے کہ یہ اسلام کی پہلی کتاب ہے..... کشف الظنون میں ہے کہ اول کتاب وضع فی الاسلام موطا مالک بن انس (سب سے پہلی کتاب جو اسلام میں لکھی گئی وہ موطا ہے) قاضی ابوبکر بن عربی التوتنی ۵۵۲ھ موطا کی شرح میں لکھتے ہیں: هذا اول کتاب الف فی شرائع الاسلام (یہ پہلی کتاب ہے جو شریعت اسلامیہ میں لکھی گئی ہے) حضرت سفیان کہتے ہیں: اول من صنف الصحيح مالک والفضل للمتقدم (سب سے مالک نے صحیح تصنیف کی)“ (ص ۹۳، طبع معارف، پریس اعظم گڑھ ۱۳۳۰ھ)

سوتاریخی طور پر صحیح نہیں، کشف الظنون کی مذکورہ عبارت باوجود تلاش کے ہمیں نہ مل سکی، حضرت سفیان سے جو نقل کیا گیا ہے وہ بلاحوالہ ہے، یہ الفاظ سفیان کے نہیں مغلطی کے ہیں، قاضی ابوبکر بن العربی کی تہذیب الہدایہ کشف الظنون میں موجود ہے اور غالباً وہیں سے اس کو نقل کیا گیا ہے، لیکن قاضی صاحب نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی معلومات کے اعتبار سے لکھا ہے کیونکہ ان کو کتاب الآثار کا علم نہ تھا اور یہ کچھ محل تعجب نہیں، بہت سی مشہور کتابیں ہیں جن کے متعلق بعض اکابر اہل علم کو سرے سے اطلاع نہ ہو سکی، حافظ ابوسعید حلائی کا خیال ہے کہ حافظ ابوعبلی نیشاپوری جو غلط حدیث کے مشہور امام خیال کئے جاتے ہیں، صحیح بخاری سے واقف نہ تھے، اسی طرح علامہ ابن حزم کو جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ سے واقفیت نہ تھی۔

کتاب الآثار کی طرح مؤطا میں بھی احادیث صحیحہ کو بنائے اول، آثار صحابہ و تابعین کو بنائے ثانی قرار دیا گیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب مصنفی شرح مؤطا میں فرماتے ہیں:

باید دانست کہ استدلال بحديث آنحضرت ﷺ چه مسند و چه مرسل و موقوف حضرت عمرو بن عبد اللہ بن عمرو اخذ بفتاویٰ صحابہ و تابعین مدینہ خصوصاً کہ جمعہ مجتمع شدہ باشند اصل مذہب مالک است۔ (۱)

”جاننا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث سے خواہ وہ مسند ہو یا مرسل نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے عمل سے استدلال کرنا اور صحابہ اور تابعین مدینہ کے فتاویٰ سے اخذ کرنا خصوصاً جبکہ ان تابعین کی ایک جماعت کسی مسئلہ پر متفق ہو، امام مالک کے مذہب کا اصول ہے۔“

اور حافظ ابن حجر عسقلانی، مقدمہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:

فصنّف الإمام مالک المؤطا وتوخی فیہ القوی من حدیث أهل الحجاز ومزجه بأقوال الصحابة وفتاوی التابعین ومن بعدهم۔ (۲)

”پھر امام مالک نے مؤطا تصنیف کی اور حدیث اہل حجاز میں سے قوی روایت کو تلاش کر کے اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور تابعین و علماء مابعد کے فتاویٰ کو بھی درج کیا۔“

مؤطا کو امت میں جو قبول عام حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں، حافظ

ذہبی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

إِنَّ لِّلْمَوْطَا لَوْقَعًا فِي النُّفُوسِ وَمِهَابَةً فِي الْقُلُوبِ لَا
يُؤَازِيهَا شَيْ (۱)

”بلاشبہ موطا کی دلوں میں جو وقعت اور قلوب میں جو ہیبت ہے

اس کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

حافظ ابن حبان، کتاب الثقات میں لکھتے ہیں:

كَانَ مَالِكٌ أَوَّلَ مَنْ انْتَقَى الرِّجَالَ مِنَ الْفُقَهَاءِ بِالْمَدِينَةِ
وَأَعْرَضَ عَنْ لَيْسَ بَشَقَّةٍ فِي الْحَدِيثِ وَلَمْ يَكُنْ يَرْوِي إِلَّا مَا صَحَّ
وَلَا يَحْدُثُ إِلَّا عَنْ ثِقَةٍ. (۲)

”امام مالک، فقہاء مدینہ میں پہلے شخص ہیں، جنہوں نے رواۃ

کے بارے میں تحقیق سے کام لیا اور جو شخص حدیث میں ثقہ نہ تھا

اس سے اعراض فرمایا، وہ صحیح روایات کے علاوہ نہ کوئی اور چیز

روایت کرتے اور نہ کسی غیر ثقہ سے حدیث بیان کرتے تھے۔“

محدثین کو موطا کی صحت کا اس درجہ یقین ہے کہ امام ابو زرہ رازی

فرماتے ہیں:

لَوْ حَلَفَ رَجُلٌ بِالطَّلَاقِ عَلَى أَحَادِيثِ مَالِكٍ فِي الْمَوْطَا أَنَهَا

صَحَاحٌ لَمْ يَحْنُثْ. (۳)

(۱) مقدمۃ التحلین لمجد علی موطا الامام محمد، بحوالہ سیر النبلا ذہبی۔ (۲) تہذیب التہذیب ترجمہ امام مالک۔

(۳) تہذیب التہذیب، مناقب الامام مالک از سیوطی، ص ۴۳، طبع خیر یہ مصر ۱۳۲۵ھ۔

”اگر کوئی شخص اس بات پر طلاق کا حلف اٹھائے کہ مؤطا میں امام مالک کی جو حدیثیں ہیں، وہ صحیح ہیں تو وہ حائث نہیں ہوگا“
 نواب صدیق حسن خاں اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین میں ابو ذرغہ کے اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں:
 ”وایں وثوق واعتماد برکتب دیگر نیست“ (۱)
 اور امام شافعی فرماتے ہیں:

ما علی ظہر الأرض کتاب بعد کتاب اللہ اصح من کتاب مالک. (۲)

”روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد مالک کی کتاب سے صحیح ترکوئی کتاب نہیں۔“

اگرچہ خود علماء شوافع ہی میں کچھ لوگ ایسے ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ
 إنما قال ذلك قبل وجود کتابي البخاري ومسلم (۳)
 ”امام موصوف کا یہ فرمانا امام بخاری، اور امام مسلم کی کتابوں کے
 عالم وجود میں آنے سے پہلے تھا۔“

لہذا اب صحیحین کے علاوہ اور کسی کتاب کے متعلق اس قسم کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں (۴) اور صحیحین میں بھی ان لوگوں کے خیال میں اصحیت کے اعتبار سے صحیح

(۱) اتحاف النبلاء ص ۱۶۵ طبع نظامی کا پور ۱۳۸۸ھ۔ (۲) ترتیب الممالک ص ۴۳۔

(۳) مقدمہ ابن صلاح طبع حلب ۱۳۵۰ھ۔ (۴) اس میں شک نہیں امام شافعی کا یہ قول صحیح بخاری اور صحیح

مسلم کے وجود سے پیشتر تھا لیکن حافظ ابو زرعہ تو امام بخاری اور امام مسلم کے ہم زمان ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بخاری کا جو مقام ہے وہ صحیح مسلم کا نہیں ہے، ان لوگوں کے شبہ کا اصل منشا یہ ہے کہ مؤطا میں مرسل، منقطع اور بلاغات ہیں، جو صحیح کے لئے قاذر ہیں لیکن حافظ مغلطائی فرماتے ہیں کہ

لا فرق بین المؤطا والبخاری فی ذلک لوجودہ ایضاً فی

البخاری من التعالیق ونحوها. (۱)

”اس بارے میں مؤطا اور بخاری میں کوئی فرق نہیں کیونکہ یہ

چیزیں تو بخاری میں بھی ہیں، چنانچہ اس میں بھی تعلیقات اور اسی

قسم کی چیزیں موجود ہیں۔“

حافظ ابن حجر عسقلانی، امام مغلطائی کے اس اعتراض کا یہ جواب دیتے ہیں کہ

والفرق بین ما فیہ من المنقطع و بین ما فی البخاری أن الذی

فی المؤطا هو كذلك مسموع لما لك غالباً وهو حجة

عنده والذي فی البخاری قد حذف أسناده عمداً لأغراض

قررت فی التعالیق. (۲)

”مؤطا اور بخاری دونوں کی منقطع روایات میں فرق یہ ہے کہ

مؤطا میں اس قسم کی جو روایتیں ہیں، ان میں سے اکثر کا سماع

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اور ان دونوں کی کتابوں سے بخوبی واقف ہیں تاہم ان کو مؤطا کی احادیث کی صحت پر اس شدت سے اصرار ہے جو ابھی آپ کی نظر سے گزرا، حالانکہ صحیح مسلم کے بہت سے زوایہ اور روایات پر ان کی کڑی تنقید تاریخ دور حال کی کتابوں میں مذکور ہے، یہ تنقید اس درجہ ذنی تھی کہ خود امام مسلم کو بھی اس کے متعلق معذرت ہی سے کام لینا پڑا تھا۔

امام مالک نے اسی طرح (بصورت انقطاع ہی) کیا ہے اور وہ ان کے نزدیک حجت ہے لیکن بخاری میں اس قسم کی جو روایتیں ہیں ان کی اسناد ان وجوہ کی بناء پر جن کی تعلیقات کے سلسلہ میں تشریح کی گئی عہد ا حذف کی گئی ہے۔“ (۱)

اس پر علامہ صالح فلائی محدث نے الفیہ سیوطی کے حواشی پر لکھا ہے کہ
وفيما قاله الحافظ من الفرق بين بلاغات المؤطا ومعلقات البخاري نظر، فلو أمعن النظر في المؤطا كما أمعن النظر في البخاري لعلم أنه لا فرق بينهما وما ذكره من أن مالكا سمعها كذلك فغير مسلم لأنه يذكر بلاغاً في رواية يحيى مثلاً
أومرسلا فيرويه غيره عن مالك موصولاً مسنداً. (۲)

”حافظ ابن حجر نے بلاغات مؤطا اور تعلیقات بخاری میں جو فرق بیان کیا ہے وہ محل نظر ہے، اگر حافظ صاحب مؤطا کا بھی اسی طرح گہری نظر سے مطالعہ کرتے، جس طرح کہ انھوں نے صحیح بخاری کا کیا ہے، تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ واقعی ان دونوں کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ جو وہ فرماتے ہیں کہ امام

(۱) لیکن یہ زنی احتمال آفرینی ہے اور مقروض کو گنجائش ہے وہ یہی بات خود تعلیقات بخاری کے متعلق بھی کہہ دے کیونکہ مؤطا کی منقطع روایتیں تو موصول ثابت ہیں مگر تعلیقات بخاری میں بہت سی ایسی روایات موجود ہیں کہ جن کی اسناد پر خود حافظ صاحب کو بھی اطلاع نہ ہو سکی۔

(۲) الرسالة المستطرفة لبيان مشهور كتب السنة المشرفة از محمد جعفر كرتاني ص ۵، طبع بيروت ۱۳۳۲ھ۔

مالک نے ان روایات کا اسی شکل میں سماع کیا ہے، سو مسلم نہیں کیونکہ موطا کی ایک حدیث مثلاً یحییٰ کی روایت میں اگر بلاغاً یا مرسلہ مذکور ہوتی ہے، تو دوسرے لوگ اسی حدیث کو امام مالک سے موصولاً و مسنداً بھی روایت کرتے ہیں۔“

فتح الباری کے مقدمہ میں حافظ ابن حجر نے اسی سلسلہ میں حسب ذیل تقریر کی ہے۔

”بعض ائمہ نے امام مالک کی کتاب سے امام بخاری کی کتاب کے اصح بتانے کو مشکل قرار دیا ہے کیونکہ صحت کو مشروط رکھنے اور انتہائی احتیاط اور وثوق سے کام لینے میں دونوں شریک ہیں، رہی یہ بات کہ صحیح بخاری میں حدیثیں زیادہ ہیں، سو یہ چیز صحت کی افضلیت کو مستلزم نہیں۔

اور اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ بخاری کی اصحیت دراصل اشتراط صحت ہی کی بنا پر ہے، امام مالک چونکہ انقطاع اسناد کو قادح صحت نہیں خیال کرتے، اس لئے وہ مراسل، منقطعات اور بلاغات کی تخریج اصل موضوع کتاب میں کرتے ہیں اور امام البخاری انقطاع کو علت قادحہ سمجھتے ہیں، لہذا وہ ایسی روایات کو اصل موضوع کتاب کی بجائے اور سلسلہ میں لاتے ہیں جیسے کہ تعلیقات و تراجم ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ منقطع روایات اگرچہ ایک قوم کے نزدیک قابل احتجاج ہے مگر پھر بھی

اس کی بہ نسبت متصل روایت جبکہ دونوں کے رواۃ عدالت اور حفظ میں مشترک ہوں زیادہ قوی ہے۔

پس اس سے بخاری کی کتاب کی فضیلت عیاں ہوئی، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ امام شافعی نے جو مؤطا کو صحت میں افضل بتایا ہے، وہ ان مجموعوں کے لحاظ سے تھا کہ جو ان کے زمانے میں موجود تھے جیسے کہ جامع سفیان ثوری اور مصنف حماد بن سلمہ وغیرہ اور ان مجموعوں پر مؤطا کی تفضیل بلا کسی نزاع کے مسلم ہے۔“ (۱)

لیکن حافظ صاحب کی یہ تقریر اگر ان دونوں کتابوں کے محض ظاہری تقابل کے اعتبار سے ہے، تو بیشک صحیح ہے ورنہ حقیقت کی رو سے مؤطا کے تمام مراسیل، مقطعات اور بلاغات، متصل، مرفوع اور مسند ہیں، چنانچہ علامہ صالح فلانی لکھتے ہیں کہ

إن ابن عبد البر ذكر جميع بلاغاته و مراسيله و منقطعاته كلها موصولة بطرق صحاح إلا أربعة، وقد وصل ابن الصلاح الأربعة بتأليف مستقل وهو عندي، وعليه خطه فظهر بهذا أنه لا فرق بين المؤطا و البخاری. (۲)

”ابن عبد البر نے بجز چار روایتوں کے مؤطا کے تمام بلاغات، مراسیل اور مقطعات کو باسانید صحیحہ موصولاً ذکر کیا ہے، اور ان

(۱) ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ج ۱، ص ۸۔

(۲) الرسالة المستطرفة ص ۵۔

چار کے اتصال پر بھی ابن صلاح نے ایک مستقل تالیف کی ہے، جو میرے پاس موجود ہے اور اس پر خود ان کے قلم کی تحریر بھی ہے، لہذا اس سے ظاہر ہو گیا کہ مؤطا اور بخاری میں کچھ فرق نہیں ہے۔“

لیکن صرف اتنا ہی نہیں کہ صحت کے لحاظ سے ان دونوں کتابوں میں کچھ فرق نہیں بلکہ بعض وجوہ سے مؤطا کو صحیحین پر ترجیح ہے۔

(۱) مؤطا کی تصنیف کے وقت کبار تبع تابعین کا ایک گروہ کثیر موجود تھا، صحیحین کو یہ امتیاز حاصل نہیں۔

(۲) سابق میں گزر چکا کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک راوی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جس روایت کو بیان کرے اس کا حافظ بھی ہو لیکن امام بخاری و مسلم کے نزدیک یہ چیز مشروط نہیں۔

(۳) امام مالک کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کسی بدعتی سے خواہ وہ کیسا ہی پاکباز اور راستباز ہو، حدیث کی روایت کے روادار نہیں، برخلاف اس کے صحیحین میں مبتدعین کی روایات (بشرطیکہ وہ ثقہ اور صادق اللہجة ہوں) بکثرت موجود ہیں، محدث حاکم نیشاپوری، المدخل فی اصول الحدیث میں لکھتے ہیں:

”صحیح مختلف فیہ کی پانچویں قسم مبتدعہ اور اصحاب الاہواء کی روایات ہیں، جو

اکثر محدثین کے نزدیک مقبول ہیں جبکہ یہ لوگ سچے اور راستباز ہوں، چنانچہ محمد بن اسمعیل بخاری نے جامع صحیح میں عباد بن یعقوب رواجی سے حدیث بیان کی ہے اور ابو بکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ کہتے تھے۔ حدثنا الصدوق فی

روایتہ المتہم فی دینہ عباد بن یعقوب۔

”ہم سے عباد بن یعقوب نے حدیث بیان کی، جو اپنی روایات میں سچا اور دین میں متہم تھا۔

اسی طرح بخاری نے صحیح میں محمد بن زیاد الہاتمی، حریر بن عثمان رجبی سے احتجاج کیا ہے، حالانکہ ان کے متعلق نصب کی شہرت تھی، نیز بخاری اور مسلم دونوں ابو معاویہ محمد بن خازم اور عبید اللہ بن موسیٰ سے احتجاج پر متفق ہیں حالانکہ یہ دونوں غالی مشہور تھے۔

لیکن مالک بن انس یہ کہتے تھے کہ اس بدعتی سے حدیث نہیں لی جائے گی جو لوگوں کو اپنی بدعت کی طرف دعوت دیتا ہو اور نہ اس شخص سے جو لوگوں سے گفتگو میں دروغ بیانی سے کام لے اگرچہ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ پر دروغ بیانی کا الزام نہ ہو۔“ (۱)

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی مؤطا کو حدیث کی تمام کتابوں میں مقدم اور افضل سمجھتے ہیں، انھوں نے اپنی مشہور کتاب مصنفی شرح مؤطا کے مقدمہ میں اس کی ترجیح کے دلائل اور وجوہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے، لیکن اس سلسلہ میں محض تخمین و ظن کی بنا پر شاہ صاحب کے قلم سے بعض باتیں ایسی بھی

نکل گئی ہیں کہ جو خلاف واقع ہیں۔ (۱)

موطا میں اگرچہ غیر مدنی شیوخ سے شاذ و نادر روایتیں ہیں، تاہم اس کی ”بلاغات“ کے بارے میں حافظ جمال الدین حزی نے تہذیب الکمال میں (۱) مثلاً فصل مصنف کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بابہ دانست کہ امر وز درست مردمان پیچ کتابہ نیست کہ مصنف آں از تیج تابعین باشد غیر موطا (ص ۳)
 ”جاننا چاہئے کہ آج لوگوں کے ہاتھ میں بجز موطا کے کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس کا مصنف تیج تابعین میں سے ہو“

حالانکہ کہ امام ابو یوسف اور امام محمد دونوں تیج تابعین میں سے ہیں اور دونوں کی حدیث دفعہ میں متحد تصانیف آج بھی لوگوں کے ہاتھ میں موجود ہیں اور بعض ان میں سے طبع ہو کر شائع بھی ہو چکی ہیں۔ اسی طرح احمد و ابوداؤد کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بالجملہ ایں چہار امامان اند کہ عالم را علم ایشان احاطہ کردہ است، امام ابو حنیفہ و امام مالک و امام شافعی و امام احمد، ایں دو امام متاخر شاگرد امام مالک بودند مستندان از علم او، و در عصر تیج تابعین نبودند مگر ابو حنیفہ و امام مالک، آں یک شخصے است کہ دوس محدثین مثل احمد و بخاری و مسلم و ترمذی و ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ و داری یک حدیث ازوے در کتابہاے خود روایت نکردہ اند و در رسم روایت حدیث ازوے بطریق ثقات جاری نمود و آں دیگر شخصے است کہ اہل نقل اتفاق دارند بر آنکہ چون حدیث بروایت او ثابت شد نہ اہل صحت رسید۔ (ص ۶)

”غرض یہ کہل چار امام ہیں کہ جن کے علم نے دنیا کا احاطہ کر رکھا ہے، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد ہیں، یہ مؤخر الذکر دونوں امام، امام مالک کے شاگرد اور ان کے علم سے بہرہ مند تھے، اور تیج تابعین کے زمانہ میں صرف ابو حنیفہ اور امام مالک ہوئے ہیں، سو وہ (یعنی امام ابو حنیفہ) ایک ایسے شخص ہیں کہ جن سے سرآمد محدثین نے جیسے کہ احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور داری ہیں ایک حدیث اپنی کتاب میں روایت نہیں کی اور حدیث کی روایت کا سلسلہ ان سے بطریق ثقات جاری نہیں ہوا، اور وہ دوسرے (یعنی امام مالک) ایک ایسے شخص ہیں کہ اہل نقل کا اس پر اتفاق ہے کہ جب حدیث ان کی روایت سے ثابت ہو جائے تو صحت کے اعلیٰ معیار پر پہنچ جاتی ہے۔“ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

عبداللہ بن ادریس کوئی المتوفی ۱۹۲ھ کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ

”بیان کیا جاتا ہے کہ بلاغات کو امام مالک نے ابن ادریس سے سنا تھا۔“

اس عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ موطا کی جتنی روایات میں ”بلغنی“

(پچھلے صفحہ کا قیہ) حالانکہ (۱) امام احمد بن حنبل، امام مالک کے شاگرد نہ تھے۔ (۲) امام ابوحنیفہ تابعی ہیں اور ان کا عہد صفارتا بعین کا عہد ہے۔ (۳) امام ابوحنیفہ کی روایت جامع ترمذی اور سنن نسائی دونوں کتابوں میں موجود ہے، محدث محمد طاہر ثقفی نے مجمع بحار الانوار میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے الترمذی والنسائی (امام ابوحنیفہ سے ترمذی اور نسائی نے تخریج کی ہے) اور مسند امام احمد میں امام اعظم کی روایت مسند بریدہ میں (ج ۵ ص ۳۵ پر) موجود ہے۔ (۴) یہ بھی محض بے اصل ہے کہ ”امام ابوحنیفہ سے بطریق ثقات روایت حدیث کا سلسلہ جاری نہیں ہوا“ خود شاہ ولی اللہ صاحب نے انسان العین میں مشائخ الحرمین میں محدث عینی جعفری مغربی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مسندے برائے امام ابوحنیفہ تالیف کردہ دو آس جاععتہ ذکر کردہ در حدیث ازاں جا بطلان زعم کسانیکہ گوید سلسلہ حدیث امر در متصل نما نہ واضح ترمذی شود۔ (ص ۶ طبع احمدی دہلی)

”انھوں امام ابوحنیفہ کی ایک ایسی مسند تالیف کی ہے، جس میں اپنے سے لے کر امام

موصوف تک محدث متصل کو ذکر کیا ہے اور یہاں سے ان لوگوں کے دعویٰ کا غلط ہونا اچھی

طرح ظاہر ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا سلسلہ آج کل متصل نہیں رہا ہے۔“

یہ عینی مغربی، شاہ صاحب کے استاذ الاساتذہ ہیں ۹۸۰ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے، شاہ صاحب ان کے متعلق فرماتے ہیں ”وے استاذ جمہور اہل حرمین است“ غور کیجئے اگر امام ابوحنیفہ سے حدیث کی روایت کا سلسلہ جاری نہ ہو تو یہ حدیث کا سماع متصل امام صاحب سے لیکر شاہ صاحب کے دور تک کیسے ثابت ہو گیا، بلکہ شاہ صاحب کی اس عبارت سے تو اور یہ ظاہر ہوا کہ یہ امام اعظم ہی کی خصوصیت ہے کہ ان کی احادیث کی روایت کا سلسلہ بسند متصل اس عہد تک جاری رہا، حتیٰ کہ جو لوگ اس زمانہ میں سلسلہ اسناد کو متصل ماننے سے انکار کرتے تھے، ان کے خلاف شاہ صاحب نے اسی چیز کو دلیل میں پیش کیا ہے اور حافظ شمس الدین ذہبی نے تصریح کی ہے کہ

روی عنه من المحدثین والفقهاء عدة لا يحصون (مناقب ابی حنیفہ از ذہبی ص ۱۱ طبع مصر)

”امام ابوحنیفہ سے محدثین و فقہاء کی اتنی بڑی تعداد نے حدیث کی روایت کی ہے کہ جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔“

ان میں سے حافظ جمال الدین حزی نے تہذیب الکمال میں امام اعظم کے ترجمہ میں پچانوے مشاہیر علماء ثقات کو نام بنام ذکر کیا ہے۔

مذکور ہے، وہ سب عبداللہ بن ادریس سے سنی ہوئی ہیں، لیکن درحقیقت یہ ان بلاغات کا ذکر ہے کہ جو موطا میں حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں، چنانچہ حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں یعقوب بن شبیبہ سے نقل کرتے ہیں کہ

قيل إن جميع ما يرويه مالك في الموطأ (بلغني عن علي) أنه

سمعه من ابن إدريس (۱)

”کہا گیا ہے کہ تمام وہ روایات جن کو امام مالک، موطا میں

”بلغنی عن علی“ کہہ کر روایت کرتے ہیں وہ سب انھوں

نے ابن ادریس سے سنی ہیں۔“

اور قاضی عیاض، مدارجک میں لکھتے ہیں کہ احمد بن عبداللہ کوفی نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ امام مالک نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جس قدر روایات مرسل ذکر کی ہیں، وہ سب انھوں نے عبداللہ بن ادریس اودی سے روایت کی ہیں۔ (۲)

اسی طرح موطا کے باب الوفا بالامان میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر عن رجل من أهل الكوفة (کوفہ کے ایک شخص سے) منقول ہے جس کی تعیین میں زرقانی نے سفیان ثوری کا نام لیا ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ بھی عبداللہ بن ادریس ہی کی روایت ہو۔ (۳)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عبداللہ بن ادریس۔ (۲) اسعاف المبطا برجال الموطا از علامہ سیوطی، ص ۳۶، طبع مطبوعہ حلبی مصر ۱۳۳۹ھ (۳) یہ عبداللہ بن ادریس، امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے ہیں اور فقہاء حنفیہ میں شمار کئے جاتے ہیں، حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المصنی فی طبقات الحنفیہ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے اور (بقیہ اگلے صفحہ پر)

موطا کا زمانہ تالیف

حافظ ابن حزم نے تصریح کی ہے کہ امام مالک نے موطا کی تالیف یقیناً مکہ میں سعید انصاری کی وفات کے بعد کی ہے اور بخاری کی وفات ۱۵۴ھ میں ہوئی

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) بعض ان مسائل فقہیہ کا بھی ذکر کیا ہے جس کو یہ امام ابو حنیفہ سے روایت کرتے ہیں، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا مفصل تذکرہ لکھا ہے، جو ان افظوں میں شروع ہوتا ہے، عبد اللہ بن ادریس بن یزید بن عبد الرحمن الإمام القدوة العجوة أبو محمد الأودي الکوفي أحد الأعلام، بڑے عابد و زاہد تھے جاہ و منصب سے ہمیشہ متنفر رہے، ایک بار خلیفہ ہارون رشید نے ان کو طلب کر کے عہدہ قضا پیش کرنا چاہا، مگر انھوں نے معذرت کی کہ میں اس کا اہل نہیں، اس پر خلیفہ نے بھڑک کر کہا کہ کاش میں تیری صورت نہ دیکھتا، ابن ادریس نے بھی نہایت متانت سے جواب دیا کاش میں بھی تیری صورت نہ دیکھتا اور یہ کہہ کر دربار سے چلے آئے، بعد کو خلیفہ نے پانچ ہزار کے توڑے ان کی خدمت میں روانہ کئے مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور جو قصص رقم لیکر آیا اس سے نہایت زور سے چلا کر کہا کہ بس یہیں سے واپس چلے جاؤ، ہارون الرشید نے یہ ماجرا دیکھا، تو دوبارہ پیام بھیجا کہ آپ نے نہ ہمارا اکرام کیا اور نہ ہمارے صلہ کو قبول کیا، اب میرا بیٹا مامون آپ کی خدمت میں آئے تو اس سے حدیثیں بیان فرمائیں، ابن ادریس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ان جہاں ناصح الجماعة حدیثا (اگر وہ عام لوگوں کے ساتھ آیا تو اس سے بھی حدیثیں بیان کریں گے) چنانچہ جب حج کے موقع پر ہارون رشید کا کوفہ میں داخلہ ہوا تو اس نے قاضی ابو یوسف صاحب سے کہا کہ محدثین کو کہئے ہمارے پاس آکر حدیث شریف کا درس دیں، دو شخصوں کے علاوہ سب نے خلیفہ کی فرمائش کی تعمیل کی، یہ دو بزرگ عبد اللہ بن ادریس اور عیسیٰ بن یونس تھے، جب یہ نہ آئے تو امین و مامون دونوں شہزادے خود سوار ہو کر عبد اللہ بن ادریس کی خدمت میں حاضر ہوئے، ابن ادریس نے سوجھ بوشی ان کے سامنے بیان کیں، جب یہ روایت کر چکے، تو مامون کہنے لگا تم مجازت ہو تو ان حدیثوں کو زبانی سناؤ، ابن ادریس نے کہا سناؤ، مامون نے فوراً اپنے حافظہ سے ان کو دہرایا، یہ دیکھ ابن ادریس بھی اس کی قوت حافظہ پر عرش عرش کر گئے، یہاں سے اٹھ کر یہ دونوں شہزادے عیسیٰ بن یونس کے یہاں پہنچے اور انھوں نے بھی ان سے حدیثیں بیان کیں، جب درس ختم ہوا، تو مامون نے دس ہزار کے توڑے پیش کئے لیکن امین یونس نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ ولا شربة ماء (اُس کے عوض تو پانی کا ایک گھونٹ بھی قبول نہیں کیا جاسکتا)۔

(تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عیسیٰ بن یونس)

ہے، (۱) محدث قاضی عیاض نے مدارک میں ابو مصعب سے جو امام مالک کے شاگرد خاص ہیں، نقل کیا ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے امام مالک سے فرمائش کی تھی کہ وضع کتاباً للناس أحملهم علیہ (آپ لوگوں کے لئے ایک ایسی کتاب لکھیں کہ جس پر میں ان سے عمل کراؤں) امام مالک نے اس سلسلہ میں کچھ کہا (۲) تو منصور بولا ضعه فما أحد الیوم أعلم منك (آپ کتاب تصنیف فرمائیں، آج آپ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں) آخر امام موصوف نے موطا کی تصنیف شروع

(۱) توجیہ انظر از شیخ صالح جزائری ص ۷ طبع مصر، بحوالہ احکام ابن حزم۔

(۲) ابو مصعب کے بیان میں امام مالک کی گفتگو منقول نہیں، لیکن ابن سعد نے طبقات میں واقدی کے حوالہ سے خود امام مالک کی زبانی اس کو تفصیل سے نقل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے۔

منصور:- میرا ارادہ ہے کہ میں آپ کی اس کتاب (یعنی موطا) کے متعلق حکم دوں کہ اس کی نقلیں لی جائیں اور مسلمانوں کے پاس ہر شہر میں اس کا ایک ایک نسخہ بھیج دیا جائے اور فرمان جاری کر دوں کہ وہ اسی کے مطابق عملدرآمد کریں اور اس سے تجاوز نہ کریں اور اس کے علاوہ جو یہ نیا علم ہے، سب چھوڑ دیں کیونکہ اس علم کی اصل الہیہ کی روایت اور ان کا علم ہی ہے۔

امام مالک:- اے امیر المؤمنین ایسا نہ کیجئے، کیونکہ لوگوں کے پاس پہلے سے اقوال پہنچ چکے ہیں، انھوں نے بھی حدیثیں سنی ہیں اور ان کو روایت کیا ہے اور ہر قوم نے صحابہ اور دیگر علماء کے اختلاف کی صورت میں اسی کو اختیار کیا ہے، جو ان کے یہاں پہلے سے چلا آتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتے اور دینی زندگی گزارتے ہیں، نیز جس کے وہ معتقد ہیں، اس سے ان کا ہٹنا دشوار ہے اس لئے لوگوں کو آپ ان ہی کے حال پر چھوڑ دیجئے اور ہر اقلیم والوں نے جو کچھ اپنے لئے پسند کر رکھا ہے اس کو رہنے دیجئے۔

منصور:- اپنی قسم اگر آپ میرا کہنا مان جاتے تو میں یہی کرتا۔ (ترتیبین الممالک ص ۴۶)

حافظ ابن عبد البر، جامع بیان العلم (ج ۱ ص ۱۳۲) میں اس واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں و هذا غایۃ فی الإنصاف لمن فہم (یہ فرضی فہم کے نزدیک انتہائی انصاف کی بات ہے) جو لوگ آج کل فردوسی اختلافی مسائل میں شدت برتتے ہیں، ان کو امام مالک کے اس مشورہ سے سبق لینا چاہئے۔

کی، لیکن کتاب کے ختم ہونے سے پہلے منصور کی وفات ہو گئی۔ (۱)
اس سے معلوم ہوا کہ مؤطا کی تصنیف منصور کی فرمائش پر خود اس کے عہد میں
شروع ہوئی اور اس کی وفات کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچی، منصور نے ۶ رزی الحجہ ۵۸ھ
میں وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بیٹا محمد المہدی مسند خلافت پر متمکن ہوا اور اسی کی
خلافت کے ابتدائی زمانہ میں مؤطا کی تصنیف مکمل ہوئی۔

جامع سفیان ثوری

یہی زمانہ ہے جب امام سفیان ثوری نے جامع لکھی ہے، بعض نے اس کا
سن تصنیف ۱۶۰ھ بتایا ہے، (۲) لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ تاریخ سے ثابت
ہے کہ امام زفر کا جب بصرہ آنا ہوا تھا تو ان کے سامنے جامع سفیان لائی گئی تھی اور آپ
نے اسے دیکھ کر یہ فرمایا تھا کہ

هذا كلامنا ينسب إلى غيرنا. (۳)

”یہ ہمارا کلام غیروں سے نقل کر رہے ہیں؟“

امام زفر کی وفات ماہ شعبان ۱۵۸ھ میں ہوئی ہے، اس لئے یہ ماننا پڑے گا
کہ اس کی تصنیف ان کی وفات سے پہلے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔

امام زفر نے جامع سفیان کے بارے میں جو رائے ظاہر کی وہ اس کے فقہی

(۱) ترتیبین الممالک از سیوطی ص ۳۳۔

(۲) مقدمہ تنویر الحواک، بحوالہ قوت القلوب۔

(۳) مناقب امام عظیم از امام حافظ الدین کردی ج ۲ ص ۸۳ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۲۱ھ و مناقب الامام
العظیم از محدث ملا علی قاری ص ۵۳۵، ملا علی قاری کی تصنیف الجوہر المصعۃ کے آخر میں بطور ذیل طبع ہوئی ہے۔

مسائل سے متعلق ہے، امام سفیان ثوری کو فہ کے رہنے والے تھے، فقہ میں عموماً ان کا اور امام اعظم کا ایک مذہب ہے، امام ترمذی اپنی جامع میں سفیان ثوری کا مذہب نقل کرتے ہیں جو اکثر امام ابو حنیفہ کے موافق ہوتا ہے، امام ابو یوسف فرمایا کرتے تھے کہ

سفیان الثوري أكثر متابعة لأبي حنيفة مني. (۱)

”سفیان ثوری مجھ سے بھی زیادہ ابو حنیفہ کے متبع ہیں۔“

امام ثوری اگرچہ خود بھی امام ابو حنیفہ کی مجلس درس میں حاضر ہوئے ہیں اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں، مگر امام صاحب کی فقہ کو انھوں نے علی بن مسہر (۲) سے اخذ کیا ہے، جو امام اعظم کے مختص تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں، امام ثوری نے اپنی جامع کی تصنیف میں بھی زیادہ تر ان ہی سے مدد لی ہے، چنانچہ امام یزید بن ہارون فرماتے ہیں کہ

كان سفیان يأخذ الفقه عن علي بن مسهر من قول أبي حنيفة، وأنه

استعان به و بهذا كرهه علي كتابه هذا الذي سماه الجامع. (۳)

”سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ کی فقہ کو علی بن مسہر سے حاصل

(۱) الإنشاء في فضائل الثلاثة الأئمة الفقهاء از حافظ ابن عبد البر ص ۱۲۸ طبع مصر ۱۳۵۰ھ۔

(۲) یہ فقہ اور حدیث دونوں کے جامع تھے، امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ابو زرعہ، نسائی اور ابن حبان ان سب نے متفقہ طور پر ان کو ثقہ کہا ہے، بحلی کے الفاظ ہیں ”کان ممن جمع الحدیث والفقه“ ابن سعد لکھتے ہیں۔ کان ثقة کثیر الحدیث، ۱۸۹ھ میں وفات پائی رحمہ اللہ، تذکرۃ الحفاظ، تہذیب الجہد، الجواہر المصنوعہ اور مناقب امام اعظم موقوفہ امام کردی میں ان کا مفصل ترجمہ موجود ہے۔

(۳) مقدمہ کتاب التعلیم از علامہ مسعود بن شیبہ سندى، بحوالہ اخبار ابی حنیفہ واصحابہ مصنفہ امام طحاوی، اس کتاب کا قلمی نسخہ مجلس علمی کے کتب خانہ کراچی میں موجود ہے۔

کرتے تھے اور ان ہی کی مدد اور مذاکرہ سے انھوں نے اپنی یہ کتاب جس کا نام جامع رکھا ہے تصنیف کی ہے۔“

سفیان ثوری کی جامع ایک زمانہ میں محدثین میں بڑی مقبول و متداول رہی ہے، چنانچہ امام بخاری نے علم حدیث کی جب تحصیل شروع کی تو سب سے پہلے جن کتابوں کی طرف توجہ کی وہ سفیان ثوری کی جامع اور عبد اللہ بن مبارک اور ولید کی تصنیفات تھیں، امام بخاری نے جامع سفیان کا سماع اپنے وطن ہی میں امام ابو حفص کبیر (۱) سے کیا تھا، چنانچہ محدث خطیب بغدادی بہ سند نقل کرتے ہیں کہ

(۱) ان کا نام احمد بن حفص اور کنیت ابو حفص ہے، ان کے صاحبزادے محمد بن احمد بن حفص معروف بہ ابو حفص صغیر ہیں چونکہ باپ بیٹے دونوں کی کنیت ابو حفص ہے اس بنا پر باپ کو کبیر اور بیٹے کو صغیر کہا جاتا ہے، یہ بخارا کے ان مشاہیر ائمہ حدیث میں سے ہیں کہ جن کے دم سے وہاں علم حدیث کی گرم بازاری تھی، چنانچہ حافظ شمس الدین ذہبی نے اپنے رسالہ ”الامصار ذوات الآثار“ میں بخارا کے جن اعیان محدثین کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے ان کے نام یہ ہیں:

عیسیٰ بن موسیٰ غنّاجی، احمد بن حفص فقیہ (ابو حفص کبیر) محمد بن سلام بکدنی، عبد اللہ بن محمد مسندی، ابو عبد اللہ بخاری (صاحب الصحیح) صالح بن محمد جزّہ، (اعلان بالفتح ص ۱۳۲) حافظ سمعانی نے امام ابو حفص کبیر کے ترجمہ میں تصریح کی ہے کہ

روی عنه خلق لا يحصون (مقدمہ جواہر المعیہ)

”ان سے بے شمار خلق نے روایت کی ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ ان کی ذات سے اقلیم ماوراء النہر میں حدیث و فقہ کی جتنی اشاعت ہوئی، ان کے معاصرین میں کسی سے نہ ہوئی، بخارا کا ایک ایک گائے ان کے تلامذہ سے بھرا ہوا تھا، سمعانی نے لکھا ہے کہ صرف خُوْزَاخْنَا میں ان کے شاگردوں کی اتنی خلقت تھی کہ جو شمار سے باہر تھی، حافظ عبد القادر قرشی، سمعانی کی مذکورہ بالا تصریح کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

وهذا في قرية من قري بخارا (مقدمہ جواہر المعیہ) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

أخبرني أبو الوليد قال أنبأنا محمد بن أحمد بن محمد بن محمد بن

سليمان الحافظ قال نبأنا أبو عمرو وأحمد بن محمد بن عمر

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ”یہ بخاری کے صرف ایک قریہ کا ذکر ہے۔“

امام ابو حفص کبیر نے فقہ کی تعلیم امام ابو یوسف اور امام محمد سے حاصل کی تھی، ان کا شمار امام محمد کے کبار تلامذہ میں سے ہے، حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء کے چودھویں طبقہ میں ان کے صاحبزادے محمد بن احمد بن حفص کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ

وكان أبوه من كبار تلامذة محمد بن الحسن التتت إليه رئاسة الأصحاب ببخارا.

”ان کے والد (امام ابو حفص کبیر) امام محمد بن حسن کے بڑے شاگردوں میں سے تھے

اور بخارا میں علما و حفاظ کی سربراہی ان پر ختم تھی۔“

امام بخاری کے والد ماجد اسمعیل اور امام ابو حفص کبیر کے درمیان انتہائی محبت اور خلوص کے مراسم تھے، اسمعیل نے جس وقت وفات پائی یہ ان کے پاس ہی موجود تھے، اس وقت اسمعیل نے ان سے کہا تھا کہ لا أعلم من مالي درهماً من حرام ولا درهماً من هبة (مقدمہ فتح الباری ص ۲۸۰ طبع منیر یہ مصر)۔

”میں اپنے مال میں ایک درہم بھی حرام یا شبہ کا نہیں پاتا۔“

یہ تعلقات اسمعیل کی وفات کے بعد بھی دونوں خاندان میں بدستور قائم رہے، چنانچہ امام بخاری اور ان کے صاحبزادے امام ابو حفص صغیر مدت تک طلب حدیث میں رفیق اور ہم سفر رہے ہیں۔

ایک بار امام ابو حفص کبیر نے امام بخاری کو اس قدر مال تجارت بھیجا تھا کہ جس کو بعض تاجروں نے پانچ ہزار کے نفع سے ان سے خریدا اور بعض تاجر اس سے بھی دو گنے نفع پر لینے پر تیار تھے لیکن امام بخاری نے اپنے ارادہ کو بدلنا پسند نہ فرمایا (مقدمہ فتح الباری ص ۲۸۰)۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی فتح الباری کے مقدمہ میں امام ممدوح کو امام بخاری کے مشائخ میں شمار کیا ہے اور ان کے حق میں امام ابو حفص کبیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ هذا يسكون له صيت ”اس کا شمار ہوگا“ (مقدمہ ص ۲۸۲)۔

امام ابو حفص کبیر کی وفات ۲۵۱ھ میں ہوئی، آپ امام شافعی کے ہم عمر تھے اور ان کے بہت بعد تک زندہ رہے، آپ کے زہد و عبادت کے کچھ واقعات روضۃ العلماء امام زہدین کی کتاب ”باب في زهد العلماء و بعدہم عن السلطان“ اور باب ما يجب على العالم أن يستعمل العلم أولا ثم يعلم غيره میں مذکور ہیں۔

المقري وأبونصر أحمد بن أبي حامد الباهلي قالاً: سمعنا
أبا سعيد بكر بن منير يقول: سمعت محمد بن إسماعيل بن
إبراهيم بن المغيرة الجعفي يقول: كنت عند أبي حفص أحمد
بن حفص أسمع كتاب الجامع، جامع سفيان في كتاب
والدي فمر أبو حفص علي حرف ولم يكن عندي ما ذكر
فراجعته، فقال الثانية كذلك، فراجعته الثانية فقال
كذلك، فراجعته الثالثة فسكت سوية ثم قال من هذا قالوا
هذا ابن إسماعيل بن إبراهيم بن بردزبه فقال أبو حفص هو
كما قال واحفظوا فإن هذا يوماً يصير رجلاً (۱)

”محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ جہلی (امام بخاری) نے
بیان کیا کہ میں ابو حفص (کبیر) احمد بن حفص کے پاس جامع
سفیان کا سماع اپنے والد کی کتاب میں کر رہا تھا کہ وہ ایک حرف
سے گزرے، جو میرے یہاں نہ تھا، میں نے ان سے مراجعت
کی، انھوں نے دوبارہ وہی بتایا، میں نے دوبارہ مراجعت کی،
پھر انھوں نے وہی بتایا، آخر میں نے تیسری دفعہ مراجعت کی، تو
ذرا چپ رہے اور دریافت کرنے لگے کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے
کہا! اسماعیل بن ابراہیم بن بردزبہ کا لڑکا ہے، فرمانے لگے، اس
نے صحیح بتایا، یاد رکھو! یہ لڑکا ایک دن مرد میدان بنے گا۔“

امام اسحق بن راہویہ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ

أي الكتابين أحسن كتاب مالك أو كتاب سفیان؟

”دونوں کتابوں میں کون سی کتاب زیادہ اچھی ہے، مالک کی یا سفیان کی؟“

کہنے لگے کتاب مالک (۱) لیکن امام ابوداؤد بخستانی، صاحب سنن فرماتے ہیں کہ

جامع سفیان الثوري، فإنه أحسن ما وضع الناس في الجوامع. (۲)

”لوگوں نے اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی ہیں، سفیان ثوری

کی جامع ان سب میں اچھی ہے۔“

یہ اس دور کی ان مشہور اور مہتمم بالشان کتابوں کا ذکر تھا، جن کے مصنف اقلیم

فقہ واجتہاد کے فرمانروا رہے ہیں، بعد کے دور میں جن کتابوں نے قبول عام کی سند

حاصل کی ان کے مصنفین ان ہی حضرات کے خوشہ چیں تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب

محدث دہلوی، بحالہ نافعہ میں فرماتے ہیں:

وصحیح بخاری وصحیح مسلم ہر چند درسط و کثرت احادیث وہ چند مؤطا باشند لیکن طریق

روایت احادیث و تمیز رجال و راہ اعتبار و استنباط از مؤطا آموختہ اند۔ (۳)

”صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہر چند مؤطا سے دس گنی ہیں، مگر

حدیثوں کی روایت کا طریقہ، رجال کی تمیز اور اعتبار و استنباط کا

ڈھنگ مؤطا سے سیکھا ہے۔“

(۱) ترمذیین الممالک ص ۲۲۔

(۲) رسالۃ ابی داؤد البخستانی فی وصف تالیف کتاب السنن ص ۷ طبع مصر ۱۳۳۹ھ۔

(۳) بحالہ نافعہ ص ۵ طبع مجتہدائی دہلی ۱۳۱۲ھ۔

اس دور کے بعض اور مصنفین

منصور کے خلیفہ ہونے سے پہلے مسلمانوں میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ عام نہ تھا، اس کے عہد میں اس سلسلہ کو کافی ترقی ہوئی اور بہت سے علماء نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں مدون کیں، چنانچہ حافظ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ میں طبقہ رابعہ کے ختم پر لکھتے ہیں:

”اسی طبقہ کے دور میں دولت اسلامیہ بنی امیہ سے بنی عباس کی طرف ۱۳۲ھ میں منتقل ہوئی، اس انقلاب نے خون کے سیلاب بہا دیئے، خراسان، عراق، اور جزیرہ میں ایک عالم کا عالم جس کا شمار اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، متبع ہو گیا..... اسی زمانہ میں بصرہ میں عمرو بن عبیدہ عابد اور واصل بن عطاء غزال نمایاں ہوئے، جنہوں نے لوگوں کو مذہب اعترال اور قدر کی طرف دعوت دی اور خراسان میں جہم بن صفوان نمودار ہوا، جو تعطیل صفات باری اور خلق قرآن کا داعی تھا اور اسی کے بالمقابل خراسان میں مقاتل بن سلیمان مفسر پیدا ہوا، جس نے اثبات صفات میں اتنا غلو کیا کہ تجسیم تک نوبت پہنچا دی، آخر علماء تابعین اور ائمہ سلف ان مبتدعین کے خلاف اٹھے اور انھوں نے لوگوں کو ان کی بدعت میں مبتلا ہونے سے روکا۔“

علماء کبار نے سنن کی تدوین، فروع (فقہ) کی تالیف

اور عربیت (لغت و نحو صرف) کی تصنیف شروع کی، پھر ہارون الرشید کے زمانے میں اس سلسلہ کی کثرت ہوئی اور بہ کثرت تصانیف مدون ہو گئیں، اب علماء کا حافظہ گھٹنے لگا اور کتابیں مدون ہو گئیں تو انہیں پر اعتماد رہ گیا، اس سے پہلے صحابہ و تابعین کا علم سینوں میں تھا اور سینے ہی ان کے علم کے گنجینے تھے۔“

اور حافظ سیوطی، تاریخ الخلفاء میں ۴۳ھ کے حوادث و واقعات کے ذیل میں حافظ ذہبی سے نقل کرتے ہیں:

”اسی عہد میں علماء اسلام نے حدیث، فقہ اور تفسیر کی تدوین شروع کی، چنانچہ مکہ معظمہ میں ابن جریج نے، مدینہ منورہ میں مالک نے (انھوں نے موطا لکھی) شام میں اوزاعی نے، بصرہ میں ابن ابی عروہ اور حماد بن سلمہ وغیرہ نے، یمن میں معمر نے (۱) کوفہ میں سفیان ثوری نے تصنیفیں کیں، ابن اسحاق نے مغازی کی تالیف کی اور ابو حنیفہ نے فقہ اور اجتہادی مسائل

(۱) شاہ ولی اللہ صاحب جہ اللہ الباقیہ میں لکھتے ہیں:

قد صنف فی زمن مالک مؤطاءات کثیرة فی تخریج احادیثہ و وصل منقطعہ مثل کتاب ابن ابی ذئب، وابن عیینہ والثوری و معمر و غیرہم ممن شارک مالکاً فی الشیوخ. (ج ۱ ص ۱۳۳ طبع منیر یہ مصر)

”امام مالک کے زمانہ میں بہت سی موطائیں ان کی موطا کی احادیث کی تخریج اور ان کی منقطع روایات کے وصل کے سلسلہ میں تصنیف کی گئیں جیسے کہ ابن ابی ذئب، ابن عیینہ، ثوری اور معمر وغیرہ کی کتابیں ہیں، یہ لوگ امام مالک کے ساتھ ان کے شیوخ سے روایت کرنے میں شریک ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کو مدون کیا پھر کچھ عرصہ کے بعد ہشتم، لیث بن سعد اور ابن لہیعہ نے تصنیفات کیں، اور ان کے بعد ابن مبارک، ابو یوسف اور ابن وہب نے کتابیں لکھیں اور کثرت سے علم کی تدوین و تدوین ہوئی اور عربیت، لغت، تاریخ اور ایام عرب پر کتابیں لکھی گئیں، اس عصر سے پہلے ائمہ اپنے حفظ سے بتلاتے یا ان صحف صحیحہ سے کہ جو مضامین و ابواب پر مرتب نہ تھے، علم کی روایت کرتے تھے۔“

فن جرح و تعدیل کی ابتداء

اسی عہد میں فن جرح و تعدیل کی ابتداء ہوئی، حافظ شمس الدین سخاوی لکھتے ہیں: ”پہلی صدی ہجری جو صحابہ و کبار تابعین کے دور میں گزری، اس میں حارث اعور اور مختار کذاب جیسے اکاذب کا شخص کو چھوڑ کر کسی ضعیف الراویۃ کا تقریباً وجود نہ تھا، پھر پہلی صدی گزر کر جب دوسری صدی آئی تو اس کے اوائل میں اوساط تابعین کے اندر ضعفاء کی ایک جماعت ہوئی، جو زیادہ تر حدیث کو زبانی یاد رکھنے اور اپنے ذہن میں اس کو محفوظ کرنے کے لحاظ سے ضعیف سمجھی گئی، چنانچہ آپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ موقوف کو مرفوعاً نقل کر جاتے

(چھپے صفحہ کا بقیہ) لیکن یہ یاد رہے کہ ان مذکورین میں بجز ابن ابی ذئب کے نہ تو کسی کی تالیف کا نام موطا ہے اور نہ ان میں سے کسی کے متعلق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ اس نے کوئی کتاب موطا امام مالک کی احادیث کی تخریج اور اس کی منقطع روایات کے وصل کے لئے تصنیف کی ہے۔

ہیں، کثرت سے ارسال کرتے ہیں اور ان سے روایت میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں جیسے کہ ابوہارون عبدی وغیرہ ہیں۔

پھر جب تابعین کا آخری دور آیا یعنی ۱۵۰ھ کے قریب قریب تو ائمہ کی ایک جماعت نے توثیق و تضعیف کے لئے زبان کھولی، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ مارأیت أكذب من جابر الجعفی. (۱)

”میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا۔“

اور اعمش نے ایک جماعت کی تضعیف اور دوسروں کی توثیق کی اور شعبہ نے (۲) رجال کے بارے میں غور و فکر سے کام لیا، یہ

(۱) امام اعظمؒ کے اس قول کو امام ترمذی نے اپنی جامع کے آخر میں کتاب العلل کے اندر بایں اسناد روایت کیا ہے، حدثنا محمود بن غیلان حدثنا أبو یحیٰی الحماتی قال سمعت أبا حنیفة یقول یقول مارأیت أحدًا أكذب من جابر الجعفی ولا أفضل من عطاء بن أبی رباح (جامع ترمذی مع شرح ابن العربی ج ۳ ص ۲۰۹ طبع مصر) اور یہ عطاء بن ابی رباح جن کے متعلق امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے افضل شخص نہیں دیکھا، امام معدوح کے اکابر شیوخ میں سے ہیں، چنانچہ حافظ ذہبی، دول الاسلام (ج ۲ ص ۷۲ طبع دارۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۶۲ھ) میں تصریح کرتے ہیں کہ واکبر شیوخہ عطاء بن أبی رباح (کہ امام ابوحنیفہؒ کے شیوخ میں سب سے بڑے عطاء بن ابی رباح ہیں) امام مالک کی اسانید میں جو حیثیت مالک عن نافع عن ابن عمر کی ہے وہی حیثیت امام اعظمؒ کی اسانید میں ابوحنیفہ عن عطاء عن ابن عباس کی ہے (ملاحظہ ہو میزان کبریٰ از امام شعرانی ص ۲۸ طبع مصر ۱۳۴۲ھ)۔ امام اعظمؒ نے ان سے مکہ مکرمہ میں علم حدیث کی تحصیل کی تھی، حافظ ذہبی، مناقب ابی حنیفہ (ص ۱۱) میں لکھتے ہیں: وسمع الحدیث من عطاء بن أبی رباح بمکة (کہ امام اعظمؒ نے عطاء بن ابی رباح سے مکہ معظمہ میں حدیث کا سماع کیا ہے)۔

(۲) امام شعبہ کو فن رجال میں جو جلالتِ شان حاصل ہے اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیے کہ ایک بار امام یحییٰ بن معین سے جو فن رجال کے مشہور امام ہیں۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بڑے محتاط تھے اور بجز ثقہ کے تقریباً کسی سے روایت نہ کرتے تھے، امام مالک کا بھی یہی حال تھا۔

اور اس دور کے ان لوگوں میں سے کہ جب وہ کسی کے بارے میں کچھ کہہ دیں، تو ان کی بات مان لی جاتی ہے، معمر، ہشام دستوائی، اوزاعی، سفیان ثوری، ابن المہاشون، حماد بن سلمہ اور لیث وغیرہ ہیں، پھر ان کے بعد دوسرا طبقہ ابن المبارک، ہشیم، ابوالحسن فزاری، (۱) معانی بن عمران موصلی، بشر بن المفضل اور ابن عیینہ وغیرہ کا ہے، پھر ان ہی کے ہم زمان ایک اور طبقہ ابن علیہ، ابن وہب اور کعب جیسے حضرات کا ہے، بعد کو ان ہی کے دور میں دوا لیسے شخص جو حدیث کے حافظ اور اس فن میں حجت گزرے ہیں، تنقید رجال کے لئے اٹھے یہ یحییٰ بن سعید القطان اور عبدالرحمن بن مہدی تھے، سو جس کو یہ دونوں مجروح

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) امام ابو حنیفہ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ آپ ان کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں فرمانے لگے وہ ثقہ ہیں، میں نے کسی کو انہیں ضعیف بتاتے نہیں سنا۔ ”یہ شعبہ بن الحجاج ان کو لکھتے ہیں اور فرمائش کرتے ہیں کہ وہ حدیثیں بیان کریں اور شعبہ آخر شعبہ ہی ہیں۔“ (الإنصاف فی فضائل الأئمة الطلعة الفقهاء از حافظ عبدالبر، ص ۱۲۷)

(۱) خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک بار ایک زندیق کو قتل کے لئے لایا گیا تو وہ کہنے لگا کہ مجھے تو تم قتل کرو گے لیکن ان ایک ہزار حدیثوں کا کیا کرو گے جو میں نے وضع کی ہیں، ہارون الرشید نے فوراً جواب دیا ہائین أنت ما عدو الله عن أبي إسحق الفزاري وابن المبارک بنخلانہا فیخر جانہا حرفاً حرفاً (اے دشمن خدا تو ابوالحسن فزاری اور ابن المبارک سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے جو ان کو چھلنی میں چھان کر ان کا ایک ایک حرف نکال پھینکیں گے)۔ (تذکرۃ الحفاظ، ترجمہ امام ابوالحسن فزاری)۔

کردیں، اس کی جرح مندرجہ نہیں ہوتی اور جس کی یہ دونوں توثیق کردیں، وہ مقبول ہے اور جس کے متعلق ان کے باہم اختلاف ہو (اور ایسے بہت کم اشخاص ہیں) اس کے بارے میں اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے۔“ (۱)

اس دور میں علماء کا طرز عمل

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے الإنصاف فی بیان سبب الاختلاف اور حجة الله البالغة میں اس پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو ہدیہ ناظرین ہے، فرماتے ہیں:

”اس طبقہ کے علماء کا طرز عمل ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے خواہ وہ مرسل ہو یا مسند دونوں سے تمسک کیا جائے۔

نیز صحابہ اور تابعین کے اقوال سے استدلال کیا جائے کیونکہ ان کے علم میں یہ اقوال یا خود آنحضرت ﷺ کی احادیث منقولہ تھیں، جن کو انھوں نے مختصر کر کے موقوف بنالیا تھا (چنانچہ ابراہیم نخعی نے ایک موقع پر جبکہ انھوں نے یہ حدیث روایت کی تھی کہ آنحضرت ﷺ نے محافلہ (۲) اور مزاہبہ سے

(۱) فتح المغیث ص ۹۷ طبع مکتبہ ۱۳۰۳ھ اور الاعلان بالتوضیح ص ۱۶۳۔

(۲) ”محافلہ“ بروزن مفاصلہ کھل سے ہے جس کے معنی زراعت اور کاشتکاری کے ہیں اور اصطلاح فقہ میں عام طور پر زمین کو بنائی یعنی تہائی یا چوتھائی پیداوار پر دینے کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

منع فرمایا ہے اور ان سے کہا گیا تھا کہ کیا تمہیں اس کے سوا اور کوئی حدیث آنحضرت ﷺ سے یاد ہی نہیں، کہا تھا کیوں نہیں؟ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ قال عبد اللہ اور قال علقمہ مجھے زیادہ پسند ہے، اسی طرح شعی نے جس وقت ان سے ایک حدیث کی بابت سوال کیا اور کہا گیا کہ اس کو رسول اللہ ﷺ تک مرفوع کر دیا جائے تو یہ جواب دیا تھا کہ نہیں مرفوع نہ کرو ہم کو یہ زیادہ محبوب ہے کہ پیغمبر ﷺ کے بعد کے کسی شخص سے اس کو نقل کیا جائے، کیونکہ اگر روایت میں کچھ کمی بیشی ہوگی، تو وہ بعد کے شخص پر ہی رہے گی) یا پھر حکم منصوص ہے ان کا استنباط یا اپنی آراء سے ان کا اجتہاد تھا، اور ہر صورت میں صحابہ اور تابعین اپنے طرز عمل کے اعتبار سے بعد کے آنے والوں سے کہیں بہتر اور کہیں زیادہ صائب الرائے نیز زمانہ کے لحاظ سے سب سے مقدم اور علم کے اعتبار سے سب سے بڑھ چڑھ کر تھے، لہذا سوائے اس صورت کے کہ ان کے باہم کسی مسئلہ میں اختلاف ہو اور آنحضرت ﷺ کی حدیث ان کے قول کے صریح خلاف موجود ہو، ہر حال میں ان کے اقوال پر عمل کرنا لازم ہے۔

اور جس صورت میں کسی مسئلہ کے اندر رسول اللہ ﷺ

(مکمل صفحہ کا بیڑہ) اور ”مزلانہ“ زین سے ہے جس کے معنی دفع کرنے کے ہیں اور فقہ میں اس کے معنی درخت کے فرمائے ترک و فرمائے خشک کے عوض میں بیج کرنے کے آتے ہیں۔

کی احادیث مختلف ہوتیں تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے تھے، اگر صحابہ کسی حدیث کے منسوخ ہونے کے قائل ہوتے یا اس کو ظاہری معنی سے پھیر دیتے (یعنی اس میں تاویل سے کام لیتے) یا اس بارے میں کچھ صراحت نہ کرتے لیکن ترک حدیث پر اور اس کے بموجب عمل نہ کرنے پر متفق ہوتے، تو یہ بات بھی اس حدیث میں بمنزلہ کسی علت کے ظاہر کرنے یا اس کے منسوخ ہونے یا اس کی تاویل کا حکم دینے کے تھی، بہر حال ان سب صورتوں میں اس طبقہ کے علماء نے صحابہ ہی کا اتباع کیا اور یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے ”کتے کے برتن میں منہ ڈالنے“ کی حدیث (۱) میں فرمایا کہ جاء هذا الحديث ولا أدري ما حقيقته (یہ روایت تو آئی ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے) امام موصوف کے اس قول کو ابن حاجب نے نقل کیا ہے، امام مالک کے فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے فقہاء کو اس پر عمل کرتے نہیں دیکھا۔

اور جب صحابہ اور تابعین کے مذاہب بھی کسی مسئلہ میں مختلف ہوتے، تو ہر عالم کے نزدیک اپنے اہل شہر اور اپنے ہی اساتذہ کا مذہب پسندیدہ تھا کیونکہ وہ ان کے صحیح اور غیر صحیح اقوال سے زیادہ باخبر ہوتا اور جو اصول کہ ان اقوال کے

(۱) یہ حدیث اس طرح ہے کہ ”جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں پے تو اسے سات بار دھوؤ“ (موطا)

مناسب ہوتے ان کو زیادہ محفوظ رکھتا تھا، نیز اس کا دل اپنے ہی اہل شہر اور اساتذہ کے فضل و تبحر کی طرف خاص طور سے مائل ہوتا تھا، چنانچہ حضرات عمر، عثمان، عائشہ، ابن عمر، ابن عباس، زید بن ثابت (رضی اللہ عنہم) اور ان کے تلامذہ جیسے سعید بن مسیبؓ کہ جو حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثوں کے سب سے زیادہ حافظ تھے اور عروہ اور سالم اور عکرمہ اور عطاء اور عبید اللہ بن عبد اللہ اور ان جیسوں کا مذہب دیگر حضرات کے مذہب کی بہ نسبت اہل مدینہ کے نزدیک زیادہ قابل اخذ تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فضائل مدینہ کے سلسلہ میں بیان فرمایا ہے، (۱) اور نیز اس وجہ سے بھی کہ

(۱) غالباً حدیث یوشک أن يضرب الناس اكباد الإبل يطلبون العلم فلا يجدون أحدا أعلم من عالم المدينة (قریب ہے کہ لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر طلب علم کے لئے سفر کریں گے اور مدینہ کے ایک عالم سے بڑھ کر کسی کو عالم نہ پائیں گے) کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ آگے چل کر شاہ ولی اللہ صاحب نے امام مالک کا ذکر کرتے ہوئے اسی حدیث کو بیان کیا ہے اور سفیان بن عیینہ اور عبد الرزاق سے تصریح نقل کی ہے کہ حضور ﷺ کی یہ پیشین گوئی امام مالک کے حق میں پوری اتری، جس طرح سے کہ ابام سیوطی اور علامہ ابن حجر مکی وغیرہ بہت سے علماء نے تصریح کی ہے کہ حدیث لو کان العلم بالشریا لتناوله أناس من أبناء فارس (مسند امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۲۹۶ و ۲۹۷) کا اولین مصداق امام ابو حنیفہؒ ہی کی ذات گرامی ہے اور خود شاہ ولی اللہ صاحب بھی اپنے مکتوب میں رقمطراز ہیں کہ

”روزے در حدیث لو کان الإسمان عند الشریا لتناوله رجال اور جل من هولاء یعنی اہل

فارس وہی روایۃ لتناوله رجال من هولاء“ بلا شک مذاکرہ کر دیم فقیر گفت امام ابو حنیفہؒ دریں حکم

داخل است کہ خدائے تعالیٰ علم فقہ را بدست وے شائع ساخت و جیسے از اہل اسلام را بآں فقہ مہذب

گردانید، خصوصاً در عصر متاخر کہ دولت ہمیں مذہب است و بس، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مدینہ منورہ ہر زمانہ میں فقہاء اور علماء کا ماویٰ اور مجمع رہا ہے اور اسی بنا پر آپ امام مالک کو دیکھیں گے کہ وہ ان ہی کے طریقہ کو پکڑے رہتے ہیں اور امام مالک کے متعلق یہ بات بھی مشہور ہے کہ وہ اہل مدینہ کے اجماع سے تمسک کرتے ہیں اور امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے کہ ”جس بات پر حرمین شریفین کا اتفاق ہو اس کو اختیار کرنا چاہئے۔“ (۱) اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کا مذہب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور شریح اور شعی کے فیصلے اور ابراہیم خنی کے فتاوے اہل کوفہ کے نزدیک دوسروں کے مذہب کی بہ نسبت زیادہ لینے کے لائق تھے اور یہی وجہ ہے کہ علقمہ نے جب مسروق کو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف تشریک (۲) کے مسئلہ میں مائل دیکھا تو کہا کہ کیا کوئی ان میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ پکا عالم ہے، مسروق نے کہا نہیں، لیکن میں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور اہل مدینہ کو تشریک کرتے دیکھا تھا۔

پھر اگر اہل شہر کسی مسئلہ پر متفق ہوتے، تو اس طبقہ کے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) دور حج بلدان و حج اقلیم بادشاہان خنی اند و قضاۃ و اکثر مدرسان و اکثر عوام خنی (ص ۱۶۸، کلمات طبیات، یعنی مجموعہ مکاتیب شاہ صاحب وغیرہ طبع بیتابی دہلی)

(۱) عمل اہل مدینہ اور اتفاق اہل حرمین شریفین کی بابت حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ ابن القیم کی بحث آپ سابق میں پڑھ چکے ہیں۔

(۲) ”تشریک“ کی صورت یہ ہے کہ مالک اپنی زمین دوسرے کو بیانی پر دے۔

علماء اس کو دانتوں سے پکڑتے تھے، چنانچہ ایسے ہی مسائل کے بارے میں امام مالک (۱) فرمایا کرتے ہیں کہ ”السنة التي لا اختلاف فيها عندنا كذا وكذا“ (یعنی یہ وہ سنت ہے کہ جس کے بارے میں ہمارے یہاں کچھ اختلاف نہیں)۔

اور جو اہل شہر میں بھی اختلاف ہوتا تو سب سے قوی اور سب سے رائج قول کو لیتے تھے، خواہ یہ قوت کثرت قائلین سے حاصل ہوتی یا کسی قیاس قوی کی موافقت سے یا کتاب و سنت کی کسی تخریج سے اور اسی قسم کے مسائل میں امام مالک (۲) یوں فرمایا کرتے ہیں کہ هذا أحسن ما سمعت (یعنی جو کچھ میں نے سنا ہے، اس میں یہ سب سے بہتر ہے)۔

اور جب صحابہ و تابعین کے ان اقوال میں بھی کہ جو ان کے پاس محفوظ تھے، مسئلہ کا جواب نہ پاتے تھے، تو ان ہی کے کلام سے اس کو نکالتے تھے اور اس کے متعلق ان کے اشارہ اور اقتضاء کو تلاش کرتے تھے۔“

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں:

وَأَلْهَمُوا فِي هَذِهِ الطَّبَقَةِ التَّدْوِينَ، فَدُون مَالِكٍ وَ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي ذَنْبٍ بِالْمَدِينَةِ، وَ ابْنِ جُرَيْجٍ وَ ابْنِ عِيْنَةَ

(۱) اور امام محمد اس موقع پر فرماتے ہیں وهو قول أبي حنيفة والعمامة من فقهاءنا۔

(۲) اور امام محمد ایسی جگہ ہو أحب إلينا لکھا کرتے ہیں۔

بمكة، والشوري بالكوفة، وربيع بن صبيح بالبصرة، وكلهم

مشوا على هذا المنهج الذي ذكرته. (۱)

”اور اسی طبقہ میں کتابوں کی تدوین دل میں ڈالی گئی، چنانچہ امام مالک اور محمد بن عبدالرحمن بن ابی ذئب نے مدینہ میں اور ابن جریج اور ابن عیینہ نے مکہ میں اور سفیان ثوری نے کوفہ میں اور ربیع بن صبیح نے بصرہ میں تصنیفیں کیں اور یہ سب حضرات اسی روش پر چلے جو میں نے بیان کی۔“

اگرچہ حدیث و روایت اور فقہ و اجتہاد کا سلسلہ تمام اسلامی شہروں میں جاری تھا اور ہر جگہ محدثین اہل روایت اور ارباب فتویٰ اور مجتہدین کی ایک جماعت موجود تھی لیکن شاہ صاحب نے مدینہ اور کوفہ کا خصوصیت سے اس لئے ذکر کیا کہ ان دونوں شہروں کو اس بارے میں مرکزیت حاصل تھی، حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں بہ سند متصل امام ابن وہب کی زبانی جو امام مالک کے مختص تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں، نقل کیا ہے کہ ایک بار امام مالک سے کسی نے مسئلہ پوچھا، آپ نے اس کا جواب دیا، اس پر سائل کی زبان سے یہ نکل گیا کہ اہل شام تو اس مسئلہ میں آپ کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

”متى كان هذا الشأن بالشام، إنما هذا الشأن وقف على أهل

المدينة والكوفة (۲)

(۱) الانصاف اور حجة الله، ”باب أسباب اختلاف الفقهاء“

(۲) جامع بیان العلم ج ۲ ص ۵۸ طبع منیر یہ مصر۔

”اہل شام کی یہ شان کب سے ہو گئی، یہ شان تو صرف اہل مدینہ اور اہل کوفہ کی ہے“

چنانچہ اس دور کے جن ائمہ اجتہاد کو حق تعالیٰ کی جانب سے قبول عام کی سند عطا ہوئی اور جن کے فقہ پر آج تک اسلامی دنیا کا غالب حصہ عمل پیرا چلا آتا ہے، وہ ان ہی دونوں مقامات کے رہنے والے تھے، ناظرین سمجھ گئے کہ ہماری مراد امام اعظم ابوحنیفہ کوئی اور امام دارالہجرت مالک بن انس اصبہی سے ہے، کیونکہ ان دونوں بزرگوں کے مسائل فقہیہ کی بنیاد ان ہی مذکورہ بالا اصولوں پر ہے، شاہ ولی اللہ صاحب قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین میں فرماتے ہیں:

”وبعد از قرآن وحدیث مدار اسلام برفقہ است، وامہات فقہ مسائل اجماعیہ فاروق است، واگر اکثر اہل اسلام را بنظر امتحان نگاہ کنی حنفیاں و مالکیاں و شافعیان اند۔“

”اور قرآن وحدیث کے بعد اسلام کا دارومدار فقہ پر ہے اور فقہ کے بنیادی مسائل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اجماعی مسائل ہیں، (یعنی جن پر آپ کے عہد خلافت میں اجماع ہو گیا تھا) اور جو اہل اسلام کی اکثریت کو جانچو، تو وہ حنفی، مالکی، اور شافعی ہی ہیں۔“

اس کے بعد لکھتے ہیں:

”و کہے کہ بر اصول وامہات ایں مذاہب اطلاع دارد شک نمی کند در آنکہ اصل ایں مذاہب مسائل اجماعیہ فاروق است، وآں مانند امر مشترک است در میان ہمہ آنها۔“

بعد ازاں اعتماد بر فقہاء صحابہ از اہل مدینہ مانند ابن عمر و عائشہ، و فقہاء سبعمہ از کبار تابعین مدینہ و زہری و مانند آں از صفارتا بعین مدینہ اصل مذہب مالک است کہ صورت خاص مذہب اوزاں پیدا شدہ۔

و بچنین اعتماد بر فتاویٰ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ در غالب حال و بر قضایائے مرتضیٰ در بعض احوال بآں شرط کہ اصحاب عبداللہ بن مسعود روایت کردہ باشند و اثبات نمودہ، و بعد ازاں بر تحقیقات ابراہیم نخعی و ثعلبی و تخریجات ایشان اصل

مذہب ابی حنفیہ است کہ سبب آں صورت خاص مذہب او پیدا شدہ۔ (۱)

”اور جو شخص کہ ان مذاہب کے اصول و امہات پر اطلاع رکھتا ہے، اس بارے میں شک نہیں کرے گا کہ ان مذاہب کی اصل حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان تمام مذاہب کے درمیان ایک مشترک سی چیز ہے۔

اس کے بعد اہل مدینہ میں سے فقہاء صحابہ جیسے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں اور کبار تابعین مدینہ میں سے فقہاء سبعمہ اور صفارتا بعین مدینہ میں سے زہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد امام مالک کے مذہب کی بنیاد ہے کہ جس سے ان کے مذہب کی ایک خاص صورت پیدا ہو گئی۔

اور اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ پر اعتماد اکثر حالات میں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلوں پر بعض

(۱) قرۃ العینین ص ۱۷۱ و ۱۷۲ طبع مکتبہ دہلی ۱۳۱۰ھ۔

حالات میں بشرطیکہ (۱) ان کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب روایت کرتے اور مانتے ہوں اور اس کے بعد ابراہیم نخعی اور شعبی کی تحقیقات اور ان کی تخریجات پر اعتماد امام ابوحنیفہ کے مذہب کی بنیاد ہے کہ جس کی وجہ سے ان کے مذہب کی ایک شکل پیدا ہو گئی۔

امام ابوحنیفہ و امام مالک کے تلامذہ اور علم حدیث دوسری صدی کے نصف ثانی میں امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے تلامذہ اسلامی دنیا کے چپہ چپہ پر پھیل چکے تھے اور ہر جگہ علوم اسلامیہ کی اشاعت میں مصروف تھے، حافظ عبدالقادر قرشی الجواہر المصنیہ کے مقدمہ میں کتاب التعلیم

(۱) اس شرط کی وجہ خود شاہ صاحب ہی قرۃ العینین میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ

اہل مدینہ و اہل شام و اہل مصر از مرتضیٰ روایت ندارند الا در غایت قلت، و اہل کوفہ روایت دارند اما پیش محدثین اکثر رواۃ حضرت مرتضیٰ مستور الیال اند غیر حفاظ، و روایت از مرتضیٰ پیش ایشان صحیح تعدد است الا از قبل اصحاب عبداللہ بن مسعود، عن ابن عیاش قال سمعت المغیرۃ یقول لم یکن یصدق علی غلبی فی الحدیث عنہ الا من اصحاب عبداللہ بن مسعود، أخرجه مسلم فی

مقدمة صحیحہ (ص ۱۸۵)

”اہل مدینہ، اہل شام اور اہل مصر حضرت علی مرتضیٰ سے نہایت کم روایت رکھتے ہیں اور اہل کوفہ آپ سے روایت رکھتے ہیں، لیکن محدثین کے نزدیک حضرت علی مرتضیٰ سے روایت کرنے والے اکثر وہ لوگ ہیں، جن کے حالات مخفی ہیں اور جو حافظ نہ تھے، ان کے نزدیک حضرت علی مرتضیٰ کی صرف وہی روایات صحیح ہوئی ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب سے آئی ہیں، چنانچہ ابوبکر بن عیاض سے مروی ہے کہ میں نے مغیرہ سے سنا، فرماتے تھے، حدیث میں حضرت علی کی صرف اسی روایت کی تصدیق کی جاتی تھی کہ جو اصحاب عبداللہ بن مسعود کی طرف سے ہوتی تھی، ابوجہر کے اس بیان کو امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔“

کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ

روى عن أبي حنيفة ونقل مذهبه نحو من أربعة الاف نفر.

”تقریباً چار ہزار افراد نے امام ابوحنیفہ سے حدیث کی روایت

کی اور ان کے مذہب کو نقل کیا ہے۔“

امام عظیم کے تلامذہ کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ خلیفہ وقت کی حدود حکومت اس سے زیادہ وسیع نہ تھیں، امام حافظ الدین ابن البرزازی کہہ دیے مناقب الامام الاعظم کے خاتمہ میں امام مدوح کے مختص تلامذہ کا تفصیلی تذکرہ لکھنے کے بعد زیر عنوان من روى عنه الحديث والفقه شرقاً وغرباً بلداً بلبداً (یعنی مشرق و مغرب میں جنہوں نے ان سے حدیث و فقہ کی روایت کی ہے) ان میں سے سات سو تیس مشاہیر علماء اعلام کے نام بقید نسب لکھے ہیں اور ضلع داران کو شمار کرایا ہے، چنانچہ جن اضلاع و ممالک کا اس سلسلہ میں انھوں نے نام لیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ، کوفہ، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقعہ، نصیبین، دمشق، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، رے، دامغان، قوہ، طبرستان، جرجان، نیشاپور، سرخس، نسا، مرو، بخارا، سمرقند، کش، صغانیان، ترمذ، بلخ، ہرات، قہستان، بختان، رَم، خوارزم۔

امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن القرات سے روایت کی ہے کہ

كان أصحاب أبي حنيفة الذين دونوا الكتب أربعين رجلاً،

وكان في العشرة المتقدمين أبو يوسف وزفر وداود الطائي و

أسد بن عمرو ويوسف بن خالد السمطي ويعحي بن زكريا بن

ابی زائده، وهو الذي كان يكتبها لهم ثلاثين سنة. (۱)
 ”امام ابوحنيفہ کے تلامذہ جنہوں نے کتابوں کی تدوین کی،
 چالیس تھے، چنانچہ ان دس اشخاص میں سے کہ جو تلامذہ متقدمین
 میں شمار کئے جاتے ہیں، یہ حضرات ہیں: امام یوسف، امام زفر،
 امام داؤد الطائی، امام اسد بن عمرو، امام یوسف بن خالد سمی، امام
 یحییٰ بن زکریا بن ابی زائده اور یحییٰ ہی تیس برس تک ان حضرات
 کے لئے کتابت کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ (۲)

(۱) الجواہر المصیۃ، ترجمہ اسد بن عمرو، یوسف بن خالد۔
 (۲) مولانا شبلی نعمانی نے اسد بن الفرات کی اس روایت کو تدوین فقہ سے متعلق خیال کیا ہے، چنانچہ
 سیرۃ العمان میں لکھتے ہیں:

”امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ”ابوحنیفہ کے
 تلامذہ جنہوں نے فقہ کی تدوین کی چالیس تھے، جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے،
 ابو یوسف، زفر، داؤد الطائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد سمی، یحییٰ بن ابی
 زائده، امام طحاوی نے یہ بھی روایت کی ہے کہ لکھنے کی خدمت یحییٰ سے متعلق تھی اور
 وہ تیس برس تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں کم
 و بیش تیس برس کا زمانہ صرف ہوا، یعنی ۱۲۱ھ سے ۱۵۰ھ تک جو امام ابوحنیفہ کی
 وفات کا سال ہے، لیکن یہ غلط ہے کہ یحییٰ شروع سے اس کام میں شریک تھے، یحییٰ
 ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اس لئے وہ شروع سے کیونکر شریک ہو سکتے تھے۔“

(ص ۲۰۰ طبع منیہ عام ۱۸۹۲ء)

مولانا نے دونوں الکسب سے فقہ کی تدوین مراد لی، پھر خود ہی اس تدوین کی مدت تیس سال یعنی
 ۱۲۱ھ سے لے کر ۱۵۰ھ تک معین فرمائی، نتیجہ یہ نکلا کہ اس روایت کے اخیر حصہ کی صحت سے ان کو انکار کرنا پڑا،
 حالانکہ اس روایت میں تدوین کتب کا ذکر ہے نہ کہ تدوین فقہ کا (اور ظاہر ہے کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسد بن فرات نے جن لوگوں کے نام گنائے ہیں، ان کے علاوہ امام عبد اللہ بن المبارک المتوفی ۱۸۱ھ امام حفص بن غیاث المتوفی ۱۹۴ھ اور امام وکیع بن الجراح المتوفی ۱۹۸ھ جو مشہور ائمہ حدیث میں شمار کئے جاتے ہیں، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس زمانہ میں ان حضرات کی تصانیف کو یہ قبول عام حاصل تھا کہ امام بخاری نے سولہ سال ہی کی عمر میں ابن مبارک اور وکیع کی تصانیف کو ازبر کر لیا تھا (۱) اور ان سب میں خصوصیت کے ساتھ یہ چار حضرات فقہ واجتہاد میں زیادہ نامور گزرے ہیں: امام زفر المتوفی ۱۵۸ھ، امام ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ، امام محمد المتوفی ۱۸۹ھ، امام حسن بن زیاد المتوفی ۲۰۴ھ اور یہ فقہ جو امام ابو حنیفہ کے انتساب سے عام طور پر فقہ حنفی کہلاتی ہے درحقیقت امام ممدوح اور ان ہی چار حضرات کے اجتہادی مسائل کا مجموعہ ہے، یہ چاروں حضرات بھی بڑے پایہ کے محدث اور حافظ الحدیث تھے، چنانچہ امام زفر کے بارے میں حافظ ابن حبان، کتاب الثقات کے طبقہ ثالثہ میں لکھتے ہیں کہ ”کان ذہر متقناً حافظاً“ (۲) اسی طرح امام یوسف کو حافظ ذہبی نے حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) یہ کتابیں موطا، جامع سفیان اور صاحبین کی تصانیف کی طرح فقہ اور حدیث دونوں کی جامع ہوں گی) اور اس کی بھی جو مدت متعین کی ہے (یعنی ۱۲۰ھ سے لے کر ۱۵۰ھ تک) وہ بھی غلط ہے کیونکہ تدوین فقہ کا کام امام اعظم نے حسب تصریح حافظ ذہبی ۱۴۳ھ کے قریب شروع کیا ہے اور خود مولانا نے بھی الفاروق میں تدوین فقہ کے آغاز کی یہی تاریخ لکھی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

”۱۴۳ھ میں جب تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی تدوین شروع ہوئی“ (ص ۴ طبع فتح المطابع لکھنؤ)

(۱) مقدمہ فتح الباری۔

(۲) اس کتاب کے قلمی نسخے حیدرآباد دکن کے کتب خانہ آصفیہ، اور کتب خانہ سعیدیہ میں ہماری نظر سے گزرے ہیں۔

اور امام محمد کے متعلق محدث دارقطنی نے بایں ہمہ شدت عصیت اپنی کتاب غرائب مالک میں تصریح کی ہے کہ ”من الشقات الحفاظ“ (۱) اور امام حسن بن زیاد سے حافظ ذہبی نے تاریخ کبیر (۲) میں خود ان کی زبانی یہ نقل کیا ہے کہ

کتبت عن ابن جریج اثنی عشر ألف حدیث کلها یحتاج إلیها الفقهاء.

”میں نے ابن جریج سے بارہ ہزار حدیثیں لکھی ہیں اور وہ سب کی سب ایسی ہیں کہ جن کی فقہاء کو ضرورت پڑتی رہتی ہے۔“

امام ابویوسف اور امام محمد کی متعدد تصانیف آج بھی موجود ہیں اور بعض ان میں سے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں (۳) اور گوان حضرات کی بلکہ تیسری چوتھی صدی تک کے متقدمین ائمہ احناف کی بہت سی تالیفات اب بالکل نایاب ہیں، لیکن بعد کے ائمہ کی وہ کتابیں جن میں ان تصانیف کی تلخیص و تہذیب کی گئی ہے بحمد اللہ آج بھی موجود و متداول ہیں، جیسے شمس الائمہ سرخسی (المتوفی ۴۹۰ھ) کی مبسوط اور ملک العلماء کاسآنی (المتوفی ۵۸۷ھ) کی بدائع الصنائع اور شیخ الاسلام برہان الدین

(۱) نصب الراية لفتح احادیث الہدایہ از حافظ زیلعی ج ۱ ص ۲۰۸ و ۲۰۹ طبع مصر۔

(۲) الاثنتا عشر سيرة الإمامین الحسن بن زیاد وصاحبه محمد بن شجاع ص ۵۰ طبع مصر ۱۳۶۸ھ۔

(۳) چنانچہ امام ابویوسف کی تصانیف میں سے کتاب الخراج، کتاب الآثار (جس کو یہ امام ابوحنیفہ سے روایت کرتے ہیں) اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلی، الرد علی سیرۃ الأوزاعی، چھپ گئی ہیں، کتاب الخراج ہ مصر میں مکرر طبع ہو چکی ہے اور بقیہ تینوں کتابیں مجلس احیاء المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن نے مولانا ابوالوفا افغانی کی تصحیح و تشریح کے اہتمام کے ساتھ مصر سے چھپوا کر شائع کی ہیں اور امام محمد کی تصانیف میں سے کتاب الحج عرصہ ہوا کہ چھپ چکی ہے اور مؤطا اور کتاب الآثار تو متعدد بار طبع ہو چکی ہیں۔

مرغینائی (المتوفی ۵۹۳ھ) کی ہدایہ کہ ان تینوں کتابوں میں جس قدر احادیث و آثار آئے ہیں، وہ اصل میں متقدمین ائمہ احناف کی کتابوں سے منقول ہیں، جن کو ان حضرات نے اپنے ائمہ کے اعتماد پر اختصار کے پیش نظر بلا ذکر حوالہ و سند درج کر دیا ہے، چنانچہ حافظ قاسم بن قطلوبغا ”منية الألمعي في مافات من تخريج أحاديث الهداية للزيلعي“ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

إن المتقدمين من علمائنا رحمهم الله كانوا يملون المسائل
الفقهية وأدلتها من الأحاديث النبوية بأسانيدهم، كأبي يوسف
في كتاب الخراج والأمالی ومحمد في كتاب الأصل
والسير وكذا الطحاوي والخفاف والرازي والكرخي، إلا في
المختصرات ثم جاء من اعتمد كتب المتقدمين وأورد
الأحاديث في كتب من غير بيان سند ولا مخرج فعكف الناس
على هذه الكتب. (ص ۹ طبع مصر ۱۳۶۹ھ)

”ہمارے علماء متقدمین (اللہ ان پر رحمتیں نازل فرمائے) مسائل
فقہ اور ان کے دلائل کا احادیث نبویہ سے اپنی اسانید کے ساتھ
املا کراتے تھے، جیسا کہ امام یوسف نے کتاب الخراج اور امالی
میں اور امام محمد نے کتاب الاصل اور کتاب السیر میں اور اسی
طرح امام طحاوی، خفاف، ابوبکر رازی اور کرخی نے (اپنی اپنی
تصانیف میں) کیا ہے، البتہ مختصرات کی املا اس سے مستثنیٰ ہے،
بعد میں وہ حضرات آئے، جنہوں نے متقدمین کی کتابوں پر

اعتماد کیا اور ان حدیثوں کو بغیر سند اور حوالہ کے اپنی تصانیف میں

درج کیا، پھر لوگ انہی تصانیف پر متوجہ ہو گئے۔“

حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کو اپنے ائمہ کی کتابوں پر ویسا ہی اعتماد تھا جیسا کہ امام بغوی اور شاہ ولی اللہ صاحب کو صحاح ستہ پر تھا اور جس طرح کہ امام بغوی نے مصابیح السنۃ میں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں ان کتابوں کی روایات کو بلا حوالہ و سند درج کر دیا ہے، اسی طرح ان حضرات نے اپنے ائمہ کی روایات کو اپنی تصانیف میں جگہ دی ہے، بعد کو جب فتنہ تاتار میں اسلامی دنیا کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور بلادِ عجم سے لے کر دار الخلافہ بغداد تک مسلمانوں کے جتنے علمی مراکز تھے ایک ایک کر کے تباہ و برباد ہو گئے، تو متقدمین کا علمی سرمایہ بہت کچھ ضائع ہو گیا اور بہت سی کتابیں جو پہلے متداول تھیں، اس فتنہ میں بالکلیہ معدوم ہو گئیں، یہی وجہ ہے کہ متاخرین حفاظ حدیث کو جنہوں نے ہدایہ وغیرہ کی احادیث کی تخریج کی ہے، متعدد روایات کے بارے میں یہ تصریح کرنا پڑی کہ ”یہ روایت ان لفظوں میں ہم کو نہ مل سکی“ کیونکہ ان ارباب تخریج نے ان روایات کو متقدمین ائمہ حنفیہ کی تصانیف میں تلاش کرنے کے بجائے محدثین مابعد کی ان کتابوں میں تلاش کیا کہ جو ان کے عہد میں متداول تھیں، اس سے بعض لوگوں کو صاحب ہدایہ کے متعلق قلت نظر اور ان حدیثوں کے متعلق ضعف کا شبہ ہونے لگا اور تعجب ہے کہ شیخ عبدالحق دہلوی بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہیں، چنانچہ وہ ہدایہ اور اس کے مصنف کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

و کتاب ہدایہ در دیار مشہور و معتبر ترین کتابہا است، نیز دریں وہم انداختہ

چہ مصنف ویدرا اکثر بنائے کار برویل معقول نہادہ واگر حدیث آورده نزد
محدثین خالی از ضعف نہ، غالباً اشتغال آں استاد، در علم حدیث کمتر بودہ
است ولیکن شرح شیخ ابن الہمام جزاہ اللہ خیر الجزاء تلافی آں نمودہ و تحقیق
کار فرمودہ است۔ (۱)

”اور کتاب ہدایہ نے بھی جو کہ اس دیار میں مشہور اور معتبر ترین
کتابوں میں سے ہے، اس وہم میں (کہ مذہب شافعی بہ نسبت
مذہب حنفی کے حدیث کے زیادہ موافق ہے) ڈال دیا ہے کیونکہ
اس کے مصنف نے بیشتر دلیل عقلی ہی پر بنا رکھی ہے اور جو حدیث
لاتے ہیں، وہ محدثین کے نزدیک ضعف سے خالی نہیں ہوتی،
غالباً ان کا شغل علم حدیث سے کم رہا ہے لیکن شیخ ابن الہمام کی
شرح ہدایہ نے (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے) اس کی
تلافی کردی اور انھوں نے تحقیق سے کام لیا ہے۔“

حالانکہ نہ تو صاحب ہدایہ کا شغل علم حدیث میں کم تھا، کیونکہ وہ خود بہت بڑے
محدث اور حافظ الحدیث تھے (۲) اور نہ جو حدیثیں وہ بیان کرتے ہیں، وہ ضعیف ہیں،

(۱) شرح سفر السعۃ از شیخ موصوف ص ۲۳، طبع نوکلشور۔

(۲) چنانچہ علامہ محمود بن سلیمان کوفی نے کتائب اعلام الأخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار
میں (جس کا قلمی نسخہ ریاست نوک کے کتب خانہ میں ہماری نظر سے گذرا ہے) صاحب ہدایہ کے متعلق ان کے
ترجمہ میں تصریح کی ہے کہ کان إماماً فقیہاً حافظاً محدثاً مفسراً اور حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر
المہیہ میں لکھا ہے کہ رحل وسمع ولقی المشائخ وجمع لنفسه مشیخۃ کتبتہا وعلقت منها
فوائد (یعنی انھوں نے طلب حدیث میں رحلت کی، حدیث کا سماع کیا، مشائخ سے ملے، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کیونکہ یہ سب حدیثیں اگلے ائمہ کی کتابوں سے منقول ہیں، خود ہم نے متعدد روایات کو دیکھا ہے کہ حافظ زیلعی اور حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ، مخرجین احادیث ہدایہ ان کے بارے میں بصراحت لکھتے ہیں کہ وہ ان کو نہ مل سکیں حالانکہ وہ روایات کتاب الآثار اور مبسوط امام محمد وغیرہ میں موجود ہیں اور یہ کچھ ہدایہ ہی کی خصوصیت نہیں، خود صحیح بخاری کی تعلیقات میں بھی بہت سی ایسی روایتیں موجود ہیں کہ جن کے بارے میں حافظ ابن حجر نے یہی تصریح کی ہے، جس کی اصل وجہ وہی ائمہ متقدمین کی کتابوں کا فقدان ہے، ورنہ امام بخاری یا صاحب ہدایہ کی یہ شان اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ ان کے متعلق کسی نے اصل روایت کے بیان کرنے کا شبہ بھی ظاہر کیا ہو۔

امام اعظم کی طرح امام مالک کے تلامذہ بھی دنیائے اسلام کے مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ محدث خطیب بغدادی نے رواق مالک میں نو سو ترانوے ۱۹۹۳ اشخاص کو اور حافظ قاضی عیاض نے اپنی تصنیف میں کچھ اوپر ایک ہزار تین سو ۱۳۰۰ اشخاص کو بقید نسب نام بنام گنایا ہے اور امام مالک سے ہر ایک کی روایت کا ذکر کیا ہے (۱) امام مالک کے تلامذہ میں عبداللہ بن وہب المتوفی ۱۹۵ھ اور عبدالرحمن بن القاسم المتوفی ۱۹۱ھ اور اشہب المتوفی ۲۰۴ھ بڑے پائے کے مصنف گزرے ہیں، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ابن وہب نے ایک لاکھ حدیثیں زبانی روایت کی ہیں اور ان کی تصانیف میں ایک لاکھ بیس ہزار حدیثیں موجود ہیں اور اس پر (پچھلے صفحہ کا بقیہ) اور اپنا مشیخ جمع کیا، جس کو میں نے بھی نقل کیا ہے اور اس سے فوائد کو اخذ کیا ہے (مشیخ وہ کتاب ہے جس میں مؤلف اپنے شیوخ کے حالات اور ان کی مرویات و اجازات کو جمع کرتا ہے۔

(۱) ملاحظہ ہو، ترمذی، المعالم، از حافظ سیوطی۔

کمال یہ ہے کہ حسب تصریح حافظ ابن عدی کی ایک حدیث بھی ان کی تصانیف میں منکر نہیں ملتی، موضوع اور ساقط الاعتبار کا تو ذکر ہی کیا ہے، (۱) ابن القاسم کا شمار بھی حافظ حدیث میں ہے، چنانچہ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے، امام مالک کی فقہ کے بھی سب سے بڑے راوی یہی ہیں۔

غرض ابھی دوسری صدی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ علم حدیث میں بکثرت تصانیف مدون ہو کر شائع ہو چکی تھیں اور امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے تلامذہ نے تمام عالم اسلام کو فقہ وحدیث سے معمور کر دیا تھا، اسی صدی میں فقہ حنفی اور فقہ مالکی کی تدوین ان احادیث وآثار کی روشنی میں مکمل ہوئی کہ جن پر فقہاء صحابہ وتابعین اور ارباب فتویٰ کا عمل درآمد چلا آتا تھا، یہ وہ زمانہ ہے کہ امام بخاری و مسلم اور دیگر مصنفین صحاح ستہ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے، ارباب صحاح ستہ نے بھی بیشتر ان ہی دونوں اماموں کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ سے علم حدیث کی تحصیل کی ہے، چنانچہ خود امام ابن ماجہ کے متعلق بھی شیخ ولی الدین خطیب صاحب مشکوٰۃ نے الاکمال میں بجائے ان کے شیوخ حدیث کا نام لینے کے صرف اس قدر لکھنے پر اکتفاء کی ہے کہ

”سمع أصحاب مالک واللیث“

”انھوں نے امام مالک اور لیث بن سعد کے شاگردوں سے حدیث سنی ہے۔“

علم حدیث تیسری صدی میں

تیسری صدی ہجری میں علم حدیث کو بڑی ترقی ہوئی اور اس فن کا ایک ایک

(۱) بستان الحمد شین از شاہ عبدالعزیز دہلوی، ص ۱۵، طبع مجتہبی دہلی۔

شعبہ پایہ تکمیل کو پہنچا، محدثین اور ارباب روایت نے (اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور فرمائے) طلب حدیث میں بحر و بر کو پے سپر کیا اور دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ چھان مارا، ایک ایک شہر اور ایک ایک قریہ میں پہنچ کر تمام منتشر اور پراگندہ روایتوں کو یکجا کیا، مسند حدیثیں علاحدہ کی گئیں، صحت سند کا التزام کیا گیا، اسماء الرجال کی تدوین ہوئی، جرح و تعدیل کا مستقل فن بن گیا اور صحاح ستہ جیسی بیش بہا کتابیں تصنیف ہوئیں۔

گذشتہ مؤلفین براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار تبع تابعین کے شاگرد تھے، بدیں وجہ ان کو اسناد کے بارے میں تحقیقات کی بہت کم ضرورت پیش آتی تھی، لیکن اس صدی میں وسائط اسناد پہلے سے کئی گنے بڑھ گئے تھے، لہذا اس دور کے محدثین کو تاریخ رجال کی طرف مستقل توجہ کرنی پڑی، جس سے اسماء الرجال کا عظیم الشان فن مدون ہوا، یہ کوئی معمولی کام نہ تھا، ہر روایت کے سلسلہ اسناد میں جتنے لوگوں کے نام آئے ہیں ان میں سے ہر ایک کی بابت یہ معلوم کرنا کہ کون تھا، کیسا تھا، کیا کرتا تھا، اس کا چال چلن کیسا تھا، سمجھ بوجھ کیسی تھی، ثقہ تھا یا غیر ثقہ، عالم تھا یا جاہل، ذہین تھا یا غبی، حافظہ کیسا تھا، یادداشت کا کیا حال تھا، کہاں کا باشندہ تھا، کس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، کہاں کہاں تحصیل علم کی، کن کن شیوخ سے ملا، کب پیدا ہوا اور کس وقت وفات پائی وغیرہ وغیرہ ان جزئی امور کا پتہ چلانا کتنا کٹھن کام تھا، مگر محدثین کے ایک گروہ کثیر نے اس کام کے لئے اپنی عمریں وقف کر دیں، شہر شہر پھرے، گاؤں گاؤں میں پہنچے، راویوں سے خود جا کر ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے حالات دریافت کئے، جس کی بدولت ہر روایت کے بارے میں اسناد کے اعتبار سے قوت وضعف، صحت و بطلان، اور اتصال و انقطاع کا فیصلہ کرنا آسان ہو گیا اور

حدیث کے متعلق بہت سی نئی اصطلاحیں، مثلاً صحیح، حسن، عزیز، غریب، ضعیف، مسند، مرسل، منقطع وغیرہ عالم وجود میں آئیں۔

اگلے علماء کے یہاں مسند و مرسل اور صحیح و حسن کی کوئی تفریق نہ تھی، وہ سب اقسام کو یکساں قابلِ حجت قرار دیتے تھے، لیکن اس صدی کے شروع ہی میں ارباب روایت میں حدیث مرسل (۱) کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا، بعض نے اس کو

(۱) ”حدیث مرسل“ محدثین کی اصطلاح میں وہ کہلاتی ہے جس میں تابعی اپنے اور آنحضرت ﷺ کے مابین جو واسطہ ہے، اس کو بیان کے بغیر قال رسول اللہ ﷺ کہے جیسا کہ عام طور پر سعید بن مسیب، بحول دمشق، ابراہیم نخعی، حسن بصری اور دیگر اکابر تابعین کا معمول تھا، پھر اگر راوی نے دو راویوں کے درمیان جو شخص واسطہ تھا، اس کو چھوڑ دیا، مثلاً ایک شخص نے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہم زمان نہ تھا قال ابو ہریرہ کہ، تو ایسی روایت محدثین کے یہاں ”منقطع“ کہلاتی ہے اور جو ایک سے زیادہ واسطے حذف کر دے تو اسے ”مفصل“ کہتے ہیں اور فقہاء اور اصولیین کے یہاں ان سب صورتوں میں اس کو ”مرسل“ ہی کہا جاتا ہے (کتاب التحقیق شرح حسامی) مرسل کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ کا فیصلہ حسب ذیل ہے:

والمراسیل قد تنازع الناس في قبولها وردها وأصح الأقوال أن منها المقبول والمردود ومنها الموقوف، فمن علم من حاله أنه لا يرسل إلا عن ثقة قبل مرسله ومن عرف أنه يرسل عن الثقة وغير الثقة كان إرساله رواية عن لا يعرف حاله فهذا موقوف، وما كان من المراسيل مخالفا لما رواه الثقات كان مردوداً وإذا كان المرسل من وجهين كل من الراويين أخذ العلم عن شيوع آخر، فهذا يدل على صدقه فإن مثل ذلك لا يتصور في العادة تماثل الخطأ فيه وتعتمد الكذب. (منهاج السراج ص ۱۷۷)

”مراسیل کے رد و قبول کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہے اور صحیح ترین قول یہ ہے کہ ان میں قابلِ قبول بھی ہیں اور قابلِ رد بھی اور وہ بھی کہ جن کے بارے میں توقف سے کام لیتا پڑے گا، چنانچہ جس شخص کی بابت یہ معلوم ہو گیا کہ وہ ثقہ کے علاوہ اور کسی سے ارسال نہیں کرتا، اس کی مرسل قبول کی جائے گی اور جس کے بارے میں یہ پتہ چل گیا کہ وہ ثقہ اور غیر ثقہ دونوں سے ارسال کرتا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حجت تسلیم کرنے سے انکار کیا، بعض نے اس کا درجہ مسند کے بعد رکھا اور بعض نے اس کو مسند پر ترجیح دی، امام محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں:

إِنَّ النَّابِعِينَ أَجْمَعُوا بِأَسْرِهِمْ عَلَى قَبُولِ الْمُرْسَلِ وَلَمْ يَأْتِ عَنْهُمْ

إِنْكَارُهُ وَلَا عَنْ أَحَدٍ مِنَ الْأُئِمَّةِ بَعْدَهُمْ إِلَى رَأْسِ الْمَائِينَ. (۱)

”تابعین سارے کے سارے مرسل کے قبول کرنے پر متفق

تھے نہ تو ان سے اور نہ ان کے بعد کسی امام سے ۲۰۰ھ ہجری تک

اس کا انکار آیا ہے۔“

مصنفین صحاح میں امام مسلم نے اپنے مقدمہ صحیح میں تصریح کی ہے کہ مرسل روایات حجت نہیں ہیں، لیکن یہ ارباب صحاح کا متفقہ مسلک نہیں ہے، امام ابوداؤد فرماتے ہیں:

فَإِذَا لَمْ يَكُنْ مُسْنَدٌ ضَدَّ الْمُرْسَلِ وَلَمْ يَوْجَدْ مُسْنَدٌ فَالْمُرْسَلِ

يَحْتَجُّ بِهِ وَلَيْسَ هُوَ مِثْلُ الْمُتَّصِلِ فِي الْقُوَّةِ. (۲)

”جب مسند، مرسل کے مخالف نہ ہو اور مسند موجود نہ ہو تو مرسل

سے احتجاج کیا جائے گا اور وہ قوت میں متصل کی طرح نہیں ہے۔“

بلکہ حافظ ابوالفرج بن الجوزی نے اپنی مشہور کتاب ”التحقیق فی

(پچھے صفحہ کا بقیہ) اس کا ارسال ایسے شخص سے روایت ہے کہ جس کا حال معلوم نہیں، پس ایسی روایت میں توقف کیا جائے گا اور جو مراسیل کہ ثقات کی روایات کے خلاف ہوں گے، وہ رد کئے جائیں گے اور جب مرسل روایت دو سندوں سے ہو اور دونوں راویوں نے الگ الگ شیوخ سے روایت کی ہو، تو یہ بات اس روایت کی صحت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ عادتاً اس طرح خطا میں یکسانی اور تصدأغلط بیانی متصور نہیں۔

(۱) منیة الألعی از حافظ قاسم بن قطلوبغا ص ۲۷۔ (۲) رسالۃ ابی داؤد ص ۵۔

أحادیث الخلاف“ میں اور محدث خطیب بغدادی نے الجامع فی آداب الراوی والسماع میں امام احمد بن حنبل سے یہاں تک نقل کیا ہے کہ

ربما كان المرسل أقوى من المسند (۱)

”بسا اوقات مرسل روایت مسند سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے۔“

مرسل کا انکار اگرچہ بعض ارباب روایت نے اپنے خیال میں احتیاط کے پیش نظر کیا تھا، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو متعدد مسائل میں جہاں مرسل کے علاوہ اور کوئی روایت مسند ان کے علم نہ تھی، اگلے ائمہ سے اختلاف کرنا اور فقہاء مجتہدین سے ارباب ظواہر کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے، متأخرین میں دارقطنی اور بیہقی بڑے نامور محدث گزرے ہیں، مگر ان دونوں کی یہ کیفیت ہے کہ سند پر سند اور روایت پر روایت ذکر کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ضعف کی ان کے پاس بجز اس کے کوئی دلیل نہیں ہوتی کہ اسے مرسل ثابت کریں یا موقوف کہیں۔

اس وقت تک مصنفین عام طور پر اپنی کتابوں میں ان ہی روایات کو جگہ دیتے تھے، جو اہل علم میں متداول چلی آتی تھیں، اس کا بھی اہتمام تھا کہ حدیث نبوی کے ساتھ صحابہ و تابعین کے اقوال بھی درج کئے جائیں، لیکن اس دور میں یہ انداز بدل گیا، اب ارباب روایت نے ہر نادر نوشتہ اور غیر متداول صحیفے کا کھوج لگالیا تھا، حجاز، عراق، شام اور مصر جملہ بلاد اسلامیہ کے افراد (۲) و غرائب (۳) خاص خاص

(۱) شرح نقایہ از محدث ملا علی قاری ج ۱ ص ۱۷ طبع ہند۔ (۲) افراد، فرد کی جمع ہے، فرد اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی روایت کسی خاص فرد یا کسی خاص مقام کے افراد کے ساتھ مخصوص و منحصر ہو۔

(۳) غرائب، غریب کی جمع ہے، غریب اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے سلسلہ سند میں کہیں نہ کہیں ایک راوی ہو۔

خاندانوں کی تحریری یادداشتیں جن کی روایت اسی خاندان میں محدود و منحصر تھی، اسی طرح کسی غیر مشہور صحابی کی کوئی روایت جس کو ان سے صرف ایک آدھ شخص روایت کرتا چلا آتا تھا، غرض تمام پریشان اور غیر متداول روایات اس عہد میں ہر طرف سے جمع کر لی گئی تھیں، طرق و اسانید کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بعض وقت تلاش و تتبع سے ایک ایک روایت کی سوسو بلکہ اس سے بھی زیادہ اسنادیں مل جاتی تھیں، اس طرح تمام اقالیم کا علم روایت جو اب تک خاص خاص سینوں یا سفینوں میں منتشر اور پراگندہ تھا، اس صدی میں محدثین کی کوششوں سے یکجا ہو گیا تھا۔

ان غرائب و افراد اور نوادر آثار کے جمع ہو جانے پر بہت سی ایسی روایات سامنے آئیں جن پر صحابہ و تابعین اور سلف مجتہدین کا عمل نہ تھا، محدثین کی ایک جماعت جو روایت سے زیادہ روایت پر زور دیتی تھی، ان روایات کی صحت پر مصرتھی ان کا خیال تھا کہ صحیح سند سے ایک چیز کے ثابت ہو جانے کے بعد اس پر عمل کرنے میں چوں و چرا کرنا دیدہ و دانستہ حدیث کی مخالفت کرنا ہے، ادھر عام اہل فتویٰ ایسی روایات کو سلف کے عدم تعامل و عدم توارث کی بنا پر شاذ اور متروک العمل سمجھتے تھے، ارباب روایت کا بڑا زور اس بات پر تھا کہ علماء صحابہ و تابعین ہمیشہ مسئلہ کے متعلق حدیث نبوی کی تلاش کرتے رہے ہیں، ہاں حدیث نہ ملتی تو مجبوراً دوسرے استدلالات سے کام لیتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ ان کا یہ دستور رہا ہے کہ اگر اسی مسئلہ میں آئندہ چل کر انہیں کوئی حدیث مل جاتی، تو وہ اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر اس پر عمل پیرا ہو جاتے تھے، لہذا صحابہ و تابعین کا کسی حدیث پر عمل نہ کرنا اس کی علت قاعدہ نہیں بن سکتا، اس نظریہ کی وجہ سے محدثین اور ارباب روایت کے ایک گروہ نے ایسی تمام

روایات کو معمول بہ قرار دیا اور ان مسائل میں سلف مجتہدین سے بالکل الگ رائے قائم کی اور صحابہ و تابعین کے جو فتاوے ان روایات کے خلاف ملے انہیں تسلیم نہ کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ ہم رجال ونحن رجال (وہ بھی مرد تھے اور ہم بھی مرد ہیں یعنی جس طرح انہیں اجتہاد کا حق تھا ہمیں بھی ہے۔)

مثلاً قسطنین (۱) کی حدیث اگلے طبقہ میں شائع نہ تھی، اس دور میں اس کی اشاعت ہوئی اور بعض ارباب روایت نے اپنے مذہب کی بنا اسی حدیث پر رکھی لیکن جن علماء کے سامنے سلف کا تعامل تھا، انہوں نے اس کو شاذ اور متروک العمل قرار دیا، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

مثاله حدیث القلتین فإنه حدیث صحیح روی بطرق كثيرة معظمتها ترجع إلى الولید بن كثير عن محمد بن جعفر بن الزبير عن عبد الله أو محمد بن عباد بن جعفر عن عبيد الله بن عبد الله كلاهما عن ابن عمر ثم تشعبت الطرق بعد ذلك وهذان وإن كانا من الشقات لكنهما ليسا ممن وسد إليهم الفتوى وعول الناس عليهم فلم يظهر الحديث في عصر سعيد بن المسيب ولا في عصر الزهري ولم يمش عليه

المالكية ولا الحنفية فلم يعملوا به. (۲)

(۱) وہ حدیث اس طرح ہے کہ ”جب پانی دو قدر ہو تو نجس نہیں ہوتا“۔ قلندہ بضم قاف وتشدید لام متعدد معنی میں مستعمل ہے جو لوگ اس روایت پر عمل کرتے ہیں وہ اس سے بڑا منکامرا دیتے ہیں جس میں پانچ سو رطل یعنی سوا چھ من پختہ پانی آئے اور بعض کہتے ہیں کہ جس میں دو یا زیادہ مشکیں ماسکیں۔

(۲) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، باب اسباب اختلاف مذہب الفقہاء۔

”اس کی مثال قلتین کی حدیث ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور بہت سے طریقوں سے مروی ہے، جو بیشتر اس سلسلہ سند پر منتہی ہوتے ہیں، ولید بن کثیر، محمد بن جعفر بن زبیر سے وہ عبد اللہ سے یا ولید سے، محمد بن عباد بن جعفر سے وہ عبید اللہ بن عبد اللہ سے پھر عبد اللہ اور عبید اللہ دونوں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پھر اس سند کے بعد اس کے بہت سے طریقے شاخ در شاخ پھیلے اور عبد اللہ اور عبید اللہ اگرچہ یہ دونوں ثقافت میں سے ہیں، لیکن ان علماء میں نہیں کہ جن پر فتوے کا مدار اور لوگوں کا مدار اور لوگوں کا اعتماد تھا، اس وجہ سے یہ حدیث نہ سعید بن المسیب کے عہد میں ظاہر ہوئی اور نہ زہری کے زمانہ میں اور نہ اس پر مالکیہ ہی چلے اور نہ حنفیہ، چنانچہ ان سب لوگوں نے اس پر عمل نہ کیا۔“

علامہ ابن القیم نے تہذیب سنن ابی داؤد میں اس حدیث کے متروک العمل ہونے پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اور بہت سے دلائل سے اس کا ناقابل قبول ہونا بیان کیا ہے، چنانچہ اس کے شذوذ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وأما الشذوذ فإن هذا حديث فاصل بين الحلال والحرام والطاهر والنجس وهي في المياه كالأوسق في الزكوة والنصب في الزكوة فكيف لا يكون مشهوراً شائعاً بين الصحابة ينقله خلف عن سلف لشدة حاجة الأمة إليه أعظم من حاجتهم إلى نصب الزكوة فإن أكثر الناس لا تعجب عليهم

زکوۃ والوضوء بالماء الطاهر فرض علی کل مسلم فیکون الواجب نقل هذا الحديث كنقل نجاسة البول ووجوب غسله ومن المعلوم أن هذا لم يروه غير ابن عمر ولا عن ابن عمر غير عبيد الله وعبد الله فأین نافع وسالم وأیوب وسعيد بن جبیر وأین أهل المدينة وعلمائهم عن هذه السنة التي مخرجها من عندهم وهم إليها أحوج الخلق لعزة الماء عندهم ومن البعيد جداً أن يكون هذه السنة عند ابن عمر ويخفى على علماء أصحابه وأهل بلده ولا يذهب إليها أحد منهم ولا يروونها ويديرونها بينهم ومن أنصب لم يخف عليه امتناع هذا فلو كانت هذه السنة العظيمة المقدار عند ابن عمر لكان أصحابه وأهل المدينة أقول الناس بها وأرواهم لها، فأی شذوذ أبلغ من هذا، وحيث لم يقل بهذا التحديد أحد من أصحاب ابن عمر أنه لم يكن فيه عنده سنة من النبي ﷺ فهذا وجه شذوذه. (۱)

”رہا شذوذ سو یہ حدیث حلال اور حرام اور پاک اور ناپاک کا

فیصلہ کرنے والی ہے اور پانیوں کے بیان میں اس کی وہی

حیثیت ہے جو زکوۃ کے سلسلہ میں اَوْسُقُ (۲) اور مختلف

نصابہائے زکوۃ کی ہے، پھر کیوں یہ حدیث صحابہ میں مشہور اور

(۱) تہذیب سنن ابی داؤد ص ۸۵ لغایت ۸۷ طبع انصاری دہلی بر حاشیہ نقیۃ المقصود شرح سنن ابی داؤد۔

(۲) اَوْسُقُ جمع ہے وُسْقُ کی، وُسْقُ ایک پیانہ ہے جو ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع آٹھ رطل کا۔

شائع نہیں ہوئی کہ خلف اس کو سلف سے نقل کرتے چلے آتے، حالانکہ امت کو نصابہائے زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر اس کی شدید حاجت ہے کیونکہ زکوٰۃ تو اکثر لوگوں پر فرض نہیں ہوتی، لیکن پاک پانی سے وضو کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، پس اس حدیث کا نقل کرنا اسی طرح واجب قرار پاتا ہے، جس طرح کہ پیشاب کی نجاست اور اس کے دھونے کی فرضیت کا نقل کرنا اور یہ بات معلوم ہے کہ اس حدیث کا بجز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اور ان سے بجز عبید اللہ اور عبد اللہ کے اور کوئی راوی نہیں ہے، پھر نافع، سالم، ایوب، اور سعید بن جبیر کدھر چلے گئے اور اہل مدینہ اور ان کے علماء اس سنت سے کہ جس کا نکاس ان ہی کے یہاں سے ہے کہاں غافل ہو گئے حالانکہ خلق اللہ میں اس سنت کی سب سے زیادہ احتیاج ان ہی کو تھی کیونکہ پانی کی ان کے یہاں بڑی قلت تھی اور یہ بات بالکل بعید ہے کہ یہ سنت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ہوتی اور ان کے اصحاب میں اور ان کے شہر میں جو اہل علم تھے ان ہی سے مخفی رہتی اور ان میں سے کوئی بھی اس سنت کی طرف نہ جاتا اور نہ وہ لوگ اس کو روایت کرتے اور نہ آپس میں اس کا چرچا کرتے، حالانکہ جو شخص بھی انصاف سے کام لے گا اس پر اس بات کا ناممکن ہونا مخفی نہ رہے گا، پس یہ سنت عظیم المرتبت اگر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ہوتی، تو ان کے اصحاب

اور اہل مدینہ سب لوگوں سے زیادہ اس کے قائل ہوتے اور سب سے زیادہ اس کو روایت کرتے، سو اس سے بڑھ کر اور کیا شذوذ ہو سکتا ہے؟ اور جبکہ اصحاب ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کوئی ایک فرد بھی اس تحدید کا قائل نہیں، تو معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس اس بارے میں کوئی سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجود نہ تھی اور یہ اس روایت کے شاذ ہونے کا بیان ہے۔“

قلین کی طرح سے ”آمین بالجہر“ کی حدیث بھی ہے، چنانچہ محدث دارقطنی اس کو اپنی سنن میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال أبو بکر هذه سنة تفرد بها أهل الكوفة.

”ابوبکر (عبداللہ بن ابی داؤد مجتہد) کا بیان ہے کہ یہ وہ سنت ہے، جس کی روایت صرف اہل کوفہ نے کی ہے۔“

اور اس پر مستزاد یہ کہ خود علماء اہل کوفہ میں سے کسی کا اس روایت پر عمل بھی نہیں ہے، اسی طرح ”خیار مجلس“ (۱) کی حدیث کہ نہ اس پر فقہاء سبعہ نے عمل کیا ہے اور نہ فقہاء کوفہ نے اور حدیث ”مصر اة“ (۲) کہ نہ اس پر امام اعظم کا عمل ہے، نہ

(۱) وہ حدیث یہ ہے کہ ”بائع اور مشتری دونوں کو اس وقت تک فسخ معاملہ کا اختیار ہے، جب تک کہ جدا نہ ہوں“ اس روایت کی بنا پر ایجاب و قبول اور بیع کے تمام ہو جانے کے بعد جب تک بائع و مشتری ایک جگہ بیٹھے ہیں بیع فسخ کی جاسکتی ہے۔ (۲) مُصْرَاة وہ دودھ کا جانور ہے کہ جس کا دودھ چند وقت نہ دوہا جائے تاکہ خریداریہ دیکھ کر یہ جانور بہت دودھ والا ہے، دھوکا کھا کر زیادہ قیمت دیدے، اور حدیث مصر اة یہ ہے کہ ”جو کوئی ایسا جانور خریدے وہ اس کے دوہنے کے بعد اختیار رکھتا ہے کہ چاہے اس کو رکھے اور چاہے واپس کر دے اور اس کے ساتھ ایک صاع خربا بائع کو دے“ یہ ایک صاع خربا اس دودھ کا عوض ہے جو مشتری نے نکالا ہے۔

امام مالک کا اور دوسری وہ تمام روایات کہ جن پر عہد صحابہ و تابعین میں ائمہ فتویٰ کا عمل نہ تھا، ان سب روایات کے بارے میں فقہاء اور ارباب روایت کا نقطہ نظر بالکل جدا جدا تھا، فقہاء ان تمام روایات کو تعامل (۱) و توارث سلف کی روشنی میں جانچتے تھے

(۱) چنانچہ اکابر علماء کی تصریح اس باب میں حسب ذیل ہے، امام مالک فرماتے ہیں:

إذا جاء عن النبي ﷺ حديثان مختلفان وبلغنا أن أبا بكر وعمر عملا بأحد الحديثين وترك الآخر كان ذلك دليلاً على أن الحق فيما عملا به (التعليق الممجد

على مؤطا امام محمد نقل عن الاستاذ كار لابن عبد البر، "باب الوضوء مما غيرت النار"

"جس وقت آنحضرت ﷺ سے دو مختلف حدیثیں آئیں اور ہمیں یہ بات پہنچے کہ

حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے ایک پر عمل کیا ہے اور دوسری کو چھوڑ دیا ہے، تو یہ اس بات

کی دلیل ہوگی کہ جس روایت پر انھوں نے عمل کیا وہی صحیح ہے"

اور محدث خلیفہ بغدادی اپنی تاریخ میں امام مہدوح سے نقل کرتے ہیں کہ

لو كان هذا الحديث هو المعمول به، لعملت به الأئمة أبو بكر وعمر وعثمان بعد رسول

الله ﷺ أن يصلي الإمام قاعداً ومن خلفه قعوداً. (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۷ طبع مصر)

"اگر یہ حدیث معمول بہ ہوتی کہ "امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو جو اس کے پیچھے ہیں وہ بھی

بیٹھ کر ہی نماز پڑھیں" تو اس پر رسول اللہ ﷺ کے بعد کے ائمہ حضرات ابو بکر و عمر

و عثمان رضی اللہ عنہم ضرور عمل کرتے۔"

اور امام ابوداؤد جہتانی، اپنی سنن میں لکھتے ہیں:

إذا تنازع الخبر ان عن النبي ﷺ ينظر بما أخذ به أصحابه. (باب لحم صيد المعمر،

باب من قال لا يقطع الصلوة شيء.)

"جب نبی ﷺ سے دو مختلف روایتیں آئیں تو یہ دیکھا جائے گا کہ صحابہ نے کس پر عمل کیا"

اور امام ابوبکر حصّ، احکام القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

مضى روي عن النبي ﷺ خبر ان متضادان وظهر عمل السلف بأحدهما كان الذي ظهر

عمل السلف به أولى بالانبات (ج ۱، ص ۱۷) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور ارباب روایت صرف صحت سند پر مدار رکھتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب ”ازالۃ الخفاء“ میں لکھتے ہیں:

اتفاق سلف وتوارث ایشاں اصل عظیم است در فقہ (۱)

اور الانصاف میں ارباب روایت کا طرز عمل یہ بتلاتے ہیں:

فإذا لم يجدوا في كتاب الله أخذوا بسنة رسول الله ﷺ سواء كان مستفيضاً دائراً بين الفقهاء أو يكون مختصاً بأهل بلد أو بأهل بيت أو بطريق خاصة، وسواء عمل به الصحابة والفقهاء أولم يعملوا به ومتى كان في المسألة حديث فلا يتبع فيها خلاف أثر من الآثار ولا اجتهد أحد من المجتهدين (باب اسباب اختلاف الفقهاء)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ”جب حضور ﷺ سے دو متضاد خبریں روایت کی جائیں اور ان

میں سے ایک پر سلف کا عمل ظاہر ہوگا اسی کا ثبوت اولیٰ ہے۔“

اور علامہ محقق کمال الدین بن الہمام، شرح ہدایہ میں رقمطراز ہیں:

ومما يصحح الحديث عمل العلماء على وفقه. (فتح القدیر شرح ہدایہ، قبیل ”باب ابقاع الطلاق“)

”اور جن امور کی بنا پر حدیث کی تصحیح کی جاتی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ علماء

اس حدیث کے موافق عمل کریں۔“

حضرت الاستاذ حیدر حسن خاں صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء نے تعامل سلف کی حجیت پر

ایک نہایت قیمتی اور نفیس رسالہ عربی زبان میں تلمیذ فرمایا ہے، جس کو ہم نے ماتمس الیہ الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجہ میں تمام وکمال نقل کر دیا ہے۔

(۱) ص ۸۵ ج ۲ طبع بریلی۔

”پھر جب وہ کتاب اللہ میں مسئلہ نہ پاتے، تو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو لیتے، خواہ وہ حدیث مشہور اور فقہاء میں دائر سائر ہوتی یا کسی شہر یا کسی خاندان یا کسی خاص طریقہ سے مخصوص ہوتی اور خواہ اس پر صحابہ اور فقہاء کا عمل ہوتا یا نہ ہوتا، اور جب تک مسئلہ میں کوئی حدیث موجود ہوتی، اس وقت تک اس مسئلہ کے خلاف نہ آخار میں سے کسی اثر کی پیروی کی جاتی اور نہ مجتہدین میں سے کسی مجتہد کے اجتہاد کی۔“

غرض یہ وہ وجوہ ہیں کہ جن کی بنا پر متقدمین میں اور اس دور کے بعض اربابِ روایت میں بہت سی احادیث کی تصحیح و تضعیف کے سلسلہ میں اختلاف ہو گیا، اسبابِ ظواہر نے اپنے مذہب کی بنا اسی عہد کی تحقیقات پر رکھی، لیکن محققین کے نزدیک اس بارے میں صدر اول کا فیصلہ معتبر ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی شرح سفر السعادة الموسوم به المنهج القويم في شرح الصراط المستقیم میں فرماتے ہیں:

ونیز حکم بہ صحت وضعف احادیث در زمان متاخر بخلاف زمان سابق است، چہ می تواند کہ حدیث در زمان ایشان صحیح باشد بسبب اجتماع شرائط صحت و قبول در رواة کہ واسطہ بودند میان ایشان و حضرت رسول اللہ ﷺ پس ازاں از جهت رواة دیگر کہ بعد ازاں آمدند ضعیف پیدا شد از حکم متاخرین محدثین ضعف حدیث لازم نیاید ضعف وے در زمان امام ابوحنیفہؒ مثلاً و ایں نکته ظاہر است و از کلاے کہ بعض محققین ذکر کرده اند کہ حکم بتواتر و شہرت و وحدت حدیث معتبر

در صدر اول است، والا بسا احادیث کہ در اس وقت از آحاد بودہ، و بعد از اس
بوجود کثرت طرق برواج اس علم و کثرت طالبان . امعان کہ بعد از اس پیدا
شدہ بمرتبہ شہرت رسیدہ باشد، استینا سے بایں معنی یافت۔ (۱)

”اور زمانہ متاخر میں حدیثوں کی صحت و ضعف کا حکم زمان
سابق سے جدا ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک حدیث متقدمین
کے زمانہ میں صحیح ہو، بسبب اس کے کہ ان راویوں میں جو
متقدمین اور آنحضرت ﷺ کے درمیان واسطہ تھے، صحت
و قبول کے شرائط جمع تھے اور بعد کو دوسرے راویوں کی وجہ سے
کہ جو ان کے بعد آئے، اس میں ضعف پیدا ہو گیا، پس
متاخرین محدثین کے کسی حدیث پر ضعف کا حکم لگا دینے سے
لازم نہیں آتا کہ وہ حدیث مثلاً امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں بھی
ضعیف ہی ہو اور یہ نکتہ ظاہر ہے اور بعض محققین کے اس بیان
سے بھی جو انھوں نے ذکر کیا ہے کہ ”حدیث کے تو اثر شہرت
اور وحدت کے بارے میں صدر اول کا حکم معتبر ہے، ورنہ بہت
سی وہ حدیثیں کہ جو اس زمانہ میں آحاد تھیں اور بعد کو ان کے
بہت سے طریقوں کے وجود میں آ جانے کے باعث کہ جو زمانہ
مابعد میں اس علم کے رواج پانے اور طالبین و مؤلفین کی کثرت
ہو جانے سے پیدا ہو گئے، شہرت کے درجہ پر جا پہنچیں گی، اس

بات پر روشنی پڑتی ہے۔“

بہر حال اس دور میں جمع روایات، تنقید احادیث، اصول روایت اور امتیاز مراتب کے سلسلہ میں بہت سی ایسی نئی چیزیں پیدا ہوئیں کہ جس کی بنا پر اس دور کے مصنفین کو حدیث کی تدوین اپنے اپنے ذوق کے مناسب نئے انداز سے کرنی پڑی، گذشتہ مؤلفین حدیث نبوی کے پہلو بہ پہلو آثار صحابہ و تابعین کو بھی درج کرتے تھے، اس عہد میں حدیث کو آثار سے علیحدہ کر کے مسند احادیث کے جمع و استقصاء کا اہتمام کیا گیا، چنانچہ ہر راوی کی تمام پریشان اور غیر مرتب روایتیں یکجا کی گئیں اور مسانید کی تصنیف کا آغاز ہوا، حافظ ابن حجر عسقلانی، مقدمہ فتح الباری میں دوسری صدی کے مشاہیر مصنفین علم حدیث کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

إلى رأي بعض الأئمة منهم أن يفرد حديث النبي ﷺ خاصة
وذلك على رأس المائتين فصنف عبيد الله بن موسى العباسي
الكوفي مسنداً وصنف مسدد بن مسرهد البصري وصنف
أسد بن موسى الأموي مسنداً وصنف نعيم بن حماد
الخراساني نزيب مصر مسنداً، ثم اقتفى الأئمة بعد ذلك
أثرهم فقلّ إمام من الحفاظ إلا وصنف حديثه على المسانيد
كالإمام أحمد بن حنبل وإسحاق بن راهويه وعثمان بن أبي
شيبه وغيرهم من النبلاء ومنهم من صنف على الأبواب
وعلى المسانيد معاً كابن أبي شيبه. (۱)

(۱) ہدی الساری للفتح الباری ج ۱ ص ۶۵ طبع منیر یہ مصر۔

”یہاں تک کہ بعض ائمہ حدیث کی یہ رائے ہوئی کہ صرف آنحضرت ﷺ ہی کی حدیثوں کو مستقل طور پر علاحدہ جمع کیا جائے اور یہ ۲۰۰ھ کے ختم پر ہوا، چنانچہ عبید اللہ بن موسیٰ عیسیٰ کوٹی، مسدد بن مسدد بصری، اسد بن موسیٰ اموی، اور نعیم بن حماد خراسانی نزیل مصر نے ایک ایک مسند تصنیف کی، پھر اور ائمہ بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلے اور حفاظ حدیث میں مشکل ہی سے کوئی امام رہا ہوگا کہ جس نے اپنی احادیث کو مسانید پر مرتب نہ کیا ہو، چنانچہ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ اور ان جیسے دیگر اکابر نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا، اور بعض محدثین نے جیسے کہ ابو بکر بن ابی شیبہ ہیں، ابواب و مسانید دونوں عنوانوں پر کتابیں لکھیں۔“

ابواب و مسانید کا فرق یہ ہے کہ ابواب میں احادیث کو باب و ارمضامین کے لحاظ سے مرتب کیا جاتا ہے، مثلاً نماز کی علاحدہ، روزہ کی علاحدہ، زہد کی علاحدہ اور مسانید میں ہر صحابی کی جملہ روایات کو بلا لحاظ مضمون یکجا ذکر کرتے ہیں مثلاً حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جتنی روایات آئیں ہیں، بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ روزہ سے متعلق ہیں یا نماز سے یا کسی اور امر سے ”مسند ابی بکر الصدیق“ کے زیر عنوان یکجا لکھ دی جائیں گی، یہ فرق تو طرز تصنیف کے اعتبار سے تھا، لیکن غور کیجئے تو روایات کے اعتماد و استناد کے لحاظ سے بھی ان دونوں طریقوں میں نمایاں امتیاز نظر آئے گا، مصنفین ابواب کے پیش نظر وہ روایات ہوتی ہیں، جن کا تعلق

عمل یا عقیدہ سے ہوتا ہے، اس لئے وہ عموماً ان روایات کو ذکر کرتے ہیں جو احتجاج یا استشہاد کے قابل ہوں، اس کے برخلاف مصنفین مسانید کا کام صرف روایات کا جمع کر دینا ہے، اس لئے وہ اس بندش سے آزاد ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں صحیح غیر صحیح ہر طرح کی روایات کا انبار نظر آئے گا، محدث حاکم نیشاپوری، ”المدخل فی أصول الحدیث“ میں لکھتے ہیں:

”ابواب و تراجم (مسانید) کا فرق یہ ہے کہ تراجم کی صورت میں شرط یہ ہے کہ مصنف یوں عنوان کرے

”ذکر ماورد عن أبي بكر الصديق عن النبي ﷺ“

”یعنی حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے واسطے سے رسول اللہ ﷺ سے جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کا بیان“

پھر دوسرا عنوان یہ ہوگا:

”ذکر ماروی قیس بن ابي حازم عن أبي بكر الصديق“

”یعنی قیس بن ابی حازم نے حضرت ابو بکر صدیق ؓ سے جو

روایتیں کی ہیں ان کا بیان“

اس صورت میں مصنف کے لئے لازمی ہے کہ قیس کے واسطے سے جس قدر

روایات حضرت ابو بکر صدیق ؓ سے مل جائیں، ان سب کی تخریج کرے، قطع نظر اس کے کہ وہ صحیح ہوں یا سقیم۔

لیکن مصنف ابواب، عنوان اس طرح قائم کرتا ہے:

ذکر ماصح وثبت عن رسول الله ﷺ في أبواب الطهارة أو

الصلوة أو غير ذلك من العبادات. (۱)

”یعنی طہارت یا نماز یا دیگر عبادات کے بارے میں جو رسول

اللہ ﷺ سے صحیح و ثابت ہے اس کا ذکر۔“

اور حافظ ابن حجر عسقلانی، ”تعییل المنفعة بن وائد رجال الأئمة

الأربعة“ میں ارقام فرماتے ہیں:

أصل وضع التصنيف للحديث على الأبواب أن يقتصر فيه

على ما يصلح للإحتجاج أو الإشتهاد بخلاف من رتب على

المسانيد فإن أصل وضعه مطلق الجمع. (۲)

”ابواب پر حدیث کی تصنیف کا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف

ان روایات تک محدود رکھا جائے کہ جن میں احتجاج یا

استشہاد کی صلاحیت ہو، برخلاف ان لوگوں کے کہ جنہوں

نے مسانید پر ترتیب کی ہے، کیونکہ مسند کی تدوین کا مقصد

صرف جمع روایات ہے۔“

بات یہ ہے کہ اہل تراجم یعنی مصنفین مسانید و معاجم کا مقصد چونکہ تمام

بکھری ہوئی روایات اور پراگندہ حدیثوں کا جمع و استقصا ہے، اس لئے ایک صحابی

اور ایک شیخ کی جتنی روایتیں ان کو مل جاتی ہیں، وہ ان کو مسند اور معجم میں جمع کر دیتے

ہیں اور چونکہ یہ ضروری نہیں کہ ہر راوی کی ہر روایت صحیح سند ہی سے منقول ہوتی چلی

آئے اس لئے جس طریقہ اور جس سند سے بھی وہ روایت ان کو پہنچتی ہے وہ اسے مع

اسناد نقل کر دیتے ہیں، بدیں وجہ صرف صحیح روایات کی تدوین ان کے موضوع تالیف سے خارج اور ان کی شرط تصنیف کے منافی ہے، ان کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ تمام پکا، پکا، صحیح، غیر صحیح، قوی غیر قوی، قابل قبول اور ناقابل قبول ہر طرف سے تلاش اور جستجو کر کے فراہم کر دیا جائے تاکہ کوئی روایت مدون ہونے سے رہنے نہ پائے اور جب یہ سارا ذخیرہ یکجا ہو کر سامنے آجائے، تو اہل فن اصول تنقید اور قواعد روایت کے مطابق ان تمام روایات کی جانچ پرتال کر کے ہر روایت کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکیں، کتب مسانید و معاجم در حقیقت طرق و اسانید کا بیش بہا دفتر ہیں، جن سے حدیث کی قوت و ضعف کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ روایت صحت کے کس معیار پر ہے اور اس کی سند کے کتنے طریقے صحیح اور کتنے ضعیف ہیں اور اگر ضعف ہے، تو کیا اس قسم کا ہے کہ چند طریقوں کے ملا لینے سے جاتا رہتا ہے اور حدیث کو قابل استناد بنا دیتا ہے مثلاً ایک حدیث کئی اسنادوں سے مروی ہے اور ہر اسناد میں ایک ایسا راوی موجود ہے کہ جس پر حافظہ کی کمی کا الزام ہے، اس لئے کیا یہ ممکن ہے کہ جملہ طرق کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ ان میں سے ہر ایک میں جو علاحدہ علاحدہ حافظہ کی کمی تھی، وہ ان سب کے متفقہ بیانات سے پوری ہو گئی، اور اسی طرح اگر وہ حدیث صحیح ہے تو کیا وہ غرائب و افراد میں سے ہے یا تعدد طرق کی بنا پر اسے شہرت کا درجہ حاصل ہے یا اسے صرف عزیز کہا جائے گا۔

غرض اب تک ابواب پر تصنیف کا رواج تھا، اب مسانید مرتب ہوئیں، محدث حاکم نیشاپوری لکھتے ہیں:

”یہ مسانید جو اسلام میں تصنیف ہوئیں صحابہ ؓ کی مرویات

ہیں، ان کا سلسلہ سند معتبر اور مجروح ہر قسم کے رواقہ پر مشتمل ہے، جیسے مسند عبید اللہ بن موسیٰ اور مسند ابی داؤد سلیمان بن داؤد طلیاتی، یہ دونوں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام میں تراجم رجال پر مسندیں تصنیف کیں، ان دونوں کے بعد احمد بن حنبل، اسحاق بن ابراہیم حنظلی، ابو یوسف زہیر بن حرب، اور عبید اللہ بن عمر قواریری نے مسانید لکھیں، پھر تو کثرت سے تراجم رجال پر مسانید کی تخریج ہوئی، اور ان سب کے جمع کرنے میں صحیح و سقیم کے امتیاز کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔“ (۱)

حاکم نے ذرا سختی کی اور سب مسانید کے بارے میں ایک عام حکم لگا دیا، بلاشبہ اکثر کتب مسانید کا یہی حال ہے تاہم بعض ائمہ نے مسانید کی تدوین میں بھی انتخاب سے کام لیا ہے اور حتیٰ الوسع قابل استناد روایات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

مسند اسحاق بن راہویہ

چنانچہ علامہ سیوطی، تدریب الراوی میں لکھتے ہیں:

وإسحق يخرج أمثل ما ورد عن ذلك الصحابي فيما ذكره أبو زرعة الرازي. (۲)

”اور اسحاق بن راہویہ جیسا کہ ابو زرعة رازی نے ذکر کیا ہے جو روایت سب سے اچھی ہوتی ہے، وہی اس صحابی سے نقل کرتے ہیں“

(۱) المدخل فی اصول الحدیث، ص ۴۲، طبع حلب۔

(۲) تدریب الراوی، ص ۵۷، طبع مصر ۱۳۰۷ھ۔

مسند امام احمد

بلکہ امام احمد کا تو یہ ارادہ تھا کہ اپنی مسند کو صحیح حدیثوں کا اتنا بڑا مجموعہ بنا دیا جائے کہ اگر کبھی علماء میں کسی حدیث کی بابت کوئی اختلاف رونما ہو تو یہ اس روایت کے استناد و عدم استناد میں دستاویز کا کام دے سکے، چنانچہ امام ممدوح کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کا بیان ہے کہ

قلت لأبي لم كرهت وضع الكتب وقد عملت المسند، فقال:
عملت هذا الكتاب إماماً إذا اختلف الناس في سنة عن رسول
الله ﷺ رجع إليه (۱)

”میں نے اپنے والد بزرگوار سے عرض کیا کہ آپ کتابوں کی تصنیف کو کیوں ناپسند فرماتے ہیں، حالانکہ آپ نے خود بھی مسند تالیف کی ہے؟ فرمانے لگے کہ میں نے تو اس کتاب کو امام بنایا ہے کہ جب لوگ رسول اللہ ﷺ کی کسی سنت میں اختلاف کریں تو اس کی طرف رجوع کیا جائے۔“

اور آپ کے برادرزادہ حنبل بن اسحاق کہتے ہیں کہ

جمعنا عمي لي ولصالح ولعبد الله وقرأ علينا المسند وما
سمعه منه تاماً غيرنا وقال لنا هذا كتاب قد جمعته وانتقيته
من أكثر من سبع مائة ألف وخمسين ألفاً فما اختلف

(۱) خصائص المسند، از حافظ ابوموسیٰ مدنی، ص ۸، طبع مصر ۱۳۲۷ھ۔

المسلمون فيه من حديث رسول الله ﷺ فارجعوا اليه فان

وجدتموه فيه وإلا فليس بحجة. (۱)

”عم محترم (امام احمد) نے مجھے اور (اپنے دونوں صاحبزادگان) صاحب اور عبد اللہ کو جمع کر کے ہمارے سامنے مسند کی قرأت کی، ہمارے سوا اور کسی نے آپ سے اس کتاب کو بہ تمام وکمال نہیں سنا ہے، اور پھر ہم سے فرمایا کہ اس کتاب کو میں نے ساڑھے سات لاکھ سے (۲) زائد روایتوں سے انتخاب کر کے جمع کیا ہے سو رسول اللہ ﷺ کی جس حدیث میں مسلمانوں کا اختلاف ہو، تم اس کتاب کی طرف رجوع کرو، اگر اس میں وہ روایت مل جائے تو فیہا ورنہ وہ حجت نہیں۔“ (۳)

(۱) مناقب احمد، از ابن جوزی ص ۱۹۱، ۱۹۲ طبع مصر ۱۳۳۹ھ وخصائص المسند ص ۹۔

(۲) یاد رہے کہ یہ تعداد متون احادیث کی نہیں، بلکہ طرق واسانید کی ہے، چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے بستان الحدیث میں اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔

(۳) امام مدوح کے اس قول کی مختلف توجہیں کی گئی ہیں، حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

هذا القول منه على غالب الأمر وإلا فلنا أحاديث قوية في الصحيحين والسنن والأجزاء ماهي في المسند، وقدر الله تعالى أن الإمام قطع الرواية قبل تهذيب المسند. وقبل وفاته بثلاث عشرة سنة فتجد في الكتاب أشياء مكررة، ودخول مسند في مسند وسند في سند، وهو نادر. (المصعد الأحمدي في ختم المسند للإمام أحمد، ص ۲۱)

”امام موصوف کا یہ فرمانا غالب حال کے اعتبار سے ہے، ورنہ ہمارے پاس صحیحین، سنن اور اجزاء میں بہت سی قوی حدیثیں موجود ہیں کہ جو مسند میں نہیں ہیں نیز اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ امام نے مسند کی تہذیب سے پہلے اور اپنی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بلاشبہ یہ کتاب ایسی ہی ہوتی، لیکن کارکنان قضاء و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا، ابھی مسند تہ تکمیل ہی تھی کہ امام ممدوح نے سفر آخرت اختیار کیا اور کتاب کا مسودہ متفرق اجزاء و اوراق میں باقی رہ گیا، حافظ ابوالخیر شمس الدین جزری، المصعد الاحمد فی ختم مسند الإمام احمد میں لکھتے ہیں:

إن الإمام أحمد شرع في جمع هذا المسند فكتبه في أوراق مفردة، وفرقه في أجزاء مفردة على ما تكون المسودة ثم جاء

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) وفات سے تیرہ سال قبل ہی حدیث کا روایت کرنا ختم کر دیا، یہی وہ ہے کہ آپ اس کتاب میں بہت سی اشیاء کو تکرر اور ایک مسند کو دوسری مسند میں داخل پائیں گے اور یہ ایک مسند کا دوسری مسند میں مل جانا نادرا ہوا ہے۔“
اور حافظ شمس الدین محمد جزری لکھتے ہیں:

وأما قوله "فما اختلف فيه من الحديث رجع إليه وإلا فليس بحجة" يريد أصول الأحاديث وهو صحيح فإنه ما من حديث غالباً إلا وله أصل في هذا المسند، واللہ تعالیٰ اعلم (المصعد الاحمد ص ۲۱)

”اور امام احمد نے جو یہ فرمایا ہے کہ ”جس حدیث میں اختلاف ہو اس کتاب کی طرف رجوع کیا جائے، اگر اس میں ہو تو فہماور نہ وہ حجت نہیں“ اس سے مراد اس حدیث کی اصل ہے اور یہ صحیح ہے، کیونکہ کوئی حدیث غالباً ایسی نہیں کہ جس کی اصل اس مسند میں نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم“

اور شاہ عبدالعزیز صاحب ہستان الحدیث میں ارتقا م فرماتے ہیں کہ راقم الحروف گوید، مراد ایشاں ہماں احادیث است کہ بدرجہ تو اترا یا شہرت نرسیدہ ائمہ و اللہ احادیث سمجھ مشہورہ بسیار راست کہ در مسند ایشاں نیست. (ص ۳۰، طبع تہبائی دہلی)

”امام موصوف کی مراد ان ہی احادیث سے ہے کہ جو شہرت یا تواثر کے درجہ تک نہیں پہنچی ہیں، در نہ بہت سی مشہور صحیح حدیثیں ہیں کہ جو ان کی مسند میں نہیں ہیں۔“

حلول المنيّة قبل حصول الأمانة فبادر بأسماعه لأولاده وأهل بيته ومات قبل تنقيحه وتهذيبه فبقي على حاله.

”امام احمد نے اس مسند کو جمع کرنا شروع کیا تو اس کو علیحدہ علیحدہ اوراق میں لکھا اور جدا جدا اجزا میں الگ الگ رکھا، جس طرح سے کہ مسودہ ہوا کرتا ہے، پھر حصول مقصد سے پہلے آپ کی وفات واقع ہو گئی، آپ نے اس کتاب کو اپنی اولاد اور اہل خاندان کو سنانے میں بڑی عجلت سے کام لیا اور اس کی تنقیح و تہذیب سے پہلے ہی آپ انتقال فرما گئے اور کتاب اسی حال میں رہ گئی۔“

یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کتاب کے اس قدر ضخیم ہونے کے کہ اس میں چالیس ہزار حدیثیں آگئی ہیں، پھر بھی احادیث صحیحہ کی بہت بڑی تعداد اس میں درج ہونے سے رہ گئی، حافظ ابن کثیر، ”اختصار علوم الحدیث“ میں لکھتے ہیں:

ان الإمام أحمد قد فاتته في كتابه هذامع أنه لا يوازيه كتاب مسند في كثرته وحسن سياقه أحاديث كثيرة جداً بل قد قيل أنه لم يقع له جماعة من الصحابة الذين في الصحيحين قريباً من مائتين. (ص ۷ طبع مکہ مکرمہ ۱۳۵۳ھ)

”امام احمد سے اپنی اس کتاب میں باوجود اس امر کے کہ کوئی اور مسند کثرت روایات اور حسن ادا میں اس کا مقابلہ نہیں کرتی، پھر بھی نہایت کثرت سے حدیثیں چھوٹ گئی ہیں، بلکہ بیان کیا گیا ہے کہ جماعت صحابہ میں دو سو کے قریب ایسے

حضرات کی روایتیں اس میں موجود نہیں ہیں کہ جن سے خود صحیحین میں حدیثیں منقول ہیں۔“

اسی طرح بعض غیر صحیح حدیثیں بھی کتاب میں داخل ہو گئی تھیں، جن میں سے بعض کو خود امام ممدوح نے بھی مسودہ میں قلم زد کر دیا تھا، چنانچہ حافظ ابو موسیٰ مدینی نے خصائص المسند میں ان میں سے بعض روایات کی نشاندہی بھی کی ہے، اسی بنا پر علماء میں یہ امر زیر بحث ہے کہ آیا اب بھی مسند میں کوئی موضوع روایت موجود ہے یا نہیں، علامہ ابن تیمیہ نے اس بحث کا فیصلہ ان الفاظ میں کیا ہے:

وقد تنازع الناس هل في مسند أحمد حديث موضوع، فقال طائفة من حفاظ الحديث كأبي العلاء الهمداني ونحوه، ليس فيه موضوع، وقال بعضهم كأبي الفرج بن الجوزي فيه موضوع، ولا خلاف بين القولين عند التحقيق، فإن لفظ الموضوع قد يراد به المخلوق المصنوع الذي يتعمد صاحبه الكذب، وهذا مما لا يعلم أن في المسند منه شيئاً، بل شرط المسند أقوى من شرط أبي داؤد في سننه، وقد روى أبو داؤد في سننه عن رجال أعرض عنهم في المسند ولهذا كان الإمام أحمد في المسند لا يروي عن من يعرف أنه يكذب مثل محمد بن سعيد المصلوب ونحوه ولكن يروي عن من يضعف لسوء حفظه فإن هذا يكتب حديثه ويعتضد به ويعتبر به.

ويراد بالموضوع ما يعلم انتفاء خبره وإن كان صاحبه لم

یتعمد الکذب، بل أخطأ فيه، وهذا الضرب في المسند منه بل وفي سنن أبي داود والنسائي وفي صحيح مسلم والبخاري أيضا ألفاظ في بعض الأحاديث من هذا الباب. (۱)

”لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا مسند احمد میں کوئی موضوع حدیث ہے یا نہیں، چنانچہ حفاظ حدیث کی ایک جماعت جیسے ابوالعلاء ہمدانی وغیرہ تو یہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی موضوع حدیث نہیں اور بعض حفاظ جیسے ابوالفرج بن الجوزی، یہ کہتے ہیں کہ اس میں موضوع روایت موجود ہے اور تحقیق کرنے پر ان دونوں قولوں میں کوئی اختلاف نہیں رہتا، کیونکہ لفظ موضوع سے کبھی تو ”جھوٹی اور گڑھی ہوئی روایت مراد ہوتی ہے کہ جس کا بیان کرنے والا قصد ادروغ بیانی سے کام لیتا ہے“ اور اس قسم کی کسی روایت کا مسند میں پتہ نہیں چلتا، بلکہ مسند کی شرط ابوداؤد کی شرط سے جو انھوں نے اپنی سنن میں ملحوظ رکھی ہے، زیادہ قوی ہے، چنانچہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں بہت سے ایسے لوگوں سے روایتیں درج کی ہیں کہ جن سے مسند میں اعراض کیا گیا ہے اور اسی لئے امام احمد اپنی مسند میں ایسے شخص سے روایت نہیں کرتے کہ جس کے بارے میں وہ یہ جانتے ہوں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے جیسے کہ محمد بن سعید مصلوب وغیرہ ہیں، لیکن اس شخص سے

روایتیں لے لیتے ہیں کہ جو حافظہ کی خرابی کی بنا پر ضعیف سمجھا جاتا ہو، کیونکہ ایسے شخص کی حدیث لکھی جاتی ہے اور دوسری روایت کی تائید اور اعتبار کے سلسلہ میں کام آتی ہے۔

اور کبھی موضوع سے مراد وہ روایت ہوتی ہے کہ ”جس کے ثبوت کی نفی معلوم ہو، اگرچہ اس کے بیان کرنے والے نے قصد اور غیانی نہ کی ہو بلکہ روایت کرنے میں چوک گیا ہو“ اور ایسی روایات مسند میں موجود ہیں، بلکہ سنن ابی داؤد اور سنن نسائی میں بھی ہیں اور صحیح مسلم اور صحیح بخاری تک میں بعض احادیث میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں۔“

بہر حال مسند احمد کی اس خصوصیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صحیح حدیثوں کا اس سے بڑا مجموعہ اور کوئی موجود نہیں، بلکہ حافظ نور الدین ہیثمی نے ”غایۃ المقصد فی زوائد المسند“ (۱) میں تصریح کی ہے کہ

مسند أحمد أصح صحیحاً من غیرہ (۲)

”صحیح ہونے میں مسند احمد اوروں کی نسبت صحیح تر ہے۔“

صحاح ستہ کی تدوین

مسانید کی تالیف سے جب تمام منتشر اور پراگندہ روایتیں یکجا ہو گئیں، تو پھر اس دور کے محدثین نے انتخاب و اختصار کا طریقہ اختیار کیا اور صحاح ستہ کی تدوین عمل

(۱) اس کتاب میں حافظ ہیثمی نے مسند امام احمد سے ان تمام روایات کو جمع کیا ہے کہ جن کو ارباب صحاح ستہ میں کسی نے روایت نہیں کیا ہے۔ (۲) تدریب الراوی ص ۵۷۔

میں آئی، امام بخاری جن کا نام مصنفین صحاح ستہ میں سرفہرست ہے، بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک روز امام اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں حاضر تھا، وہاں ہمارے اصحاب میں سے کسی کی زبان سے نکلا کہ ”لو جمعتم کتاباً مختصراً لسنن النبی ﷺ“۔

”کاش تم رسول اللہ ﷺ کی سنن کے بارے میں کوئی مختصری

کتاب جمع کر دیتے۔“

یہ خطاب تمام حاضرین مجلس سے تھا، مگر دل میں اسی کے اترا، جس کی قسمت میں روز اول سے یہ سعادت مقرر ہو چکی تھی، امام ممدوح فرماتے ہیں:

فوقع ذلك في قلبي وأخذت في جمع هذا الكتاب. (۱)

”یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں نے اس کتاب کو جمع

کرنا شروع کر دیا۔“

صحیح بخاری

ادھر مسانید کی کثرت کا یہ عالم تھا، ادھر گزشتہ دور میں ابواب پر مختلف عنوانات کے تحت بہت سی کتابیں لکھی جا چکی تھیں، امام بخاری نے ان تمام تصنیفات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور اپنے حسن ذوق سے احادیث صحیحہ کا ایک نہایت عمدہ اور مختصر مجموعہ مرتب کر کے امت کے سامنے پیش کر دیا، جس کا نام ہے، ”الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول اللہ

ﷺ و سننه وأيامه“ (۲)

(۱) شروط الأئمة الخمسة از حافظ ابوبکر حازی ص ۱۵ طبع مصر ۱۳۵۵ھ، دہندیب الجذب، ترجمہ امام بخاری۔

(۲) مقدمہ ابن صلاح وغیرہ۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

باید دانست کہ بخاری بعد مانعین ظاہر شد، و قبل از وے علماء در فنون چند از علوم دینیہ تصانیف ساختہ بودند، امام مالک و سفیان ثوری در فقہ تصنیف کردہ بودند، و ابن جریج در تفسیر، و ابو عبیدہ در غریب قرآن و محمد بن اسحاق و موسیٰ بن عقبہ در سیر، و عبد اللہ بن مبارک در زہد و مواعظ و کسائی در بدء الخلق و قصص انبیاء و یحییٰ بن معین و غیرہ در معرفت احوال صحابہ و تابعین و جمعہ دیگر رسائل داشتند در روایا و ادب و طب و شمائل و اصول حدیث و اصول فقہ و ردیر مبتدعین مثل جہمیہ، بخاری این ہمہ علوم مدونہ را تا مل فرمود و جزئیات و کلیات را انتقاد نمود، پس قدرے از علوم کہ با حدیث صحیحہ کہ بر شرط بخاری است بطریق صراحت یا دلالت یافت در کتاب خود آورد تا بدست مسلمانان در امہات ایں علوم بچنے قاطعہ بودہ باشد کہ در آں تشکیک را مدخل نہ بود۔ (۱)

”جاننا چاہئے کہ امام بخاری دو سو سال کے بعد نمودار ہوئے، ان سے پیشتر علماء علوم دینیہ میں مختلف فنون کے اندر تصنیفیں کر چکے تھے، چنانچہ امام مالک اور سفیان ثوری نے فقہ میں تصنیف کی تھی اور ابن جریج نے تفسیر میں اور ابو عبیدہ نے غریب قرآن میں اور محمد بن اسحاق اور موسیٰ بن عقبہ نے سیر میں اور عبد اللہ بن مبارک نے زہد و مواعظ میں اور کسائی نے بدء الخلق اور قصص انبیاء میں اور یحییٰ بن معین نے صحابہ و تابعین کے حالات میں

(۱) مکتوبات شاہ ولی اللہ، مندرجہ کلمات طبیات ص ۷۰ طبع مجبائی دہلی۔

نیز متعدد علماء کے فن رویا، ادب، طب، شہماکل، اصول حدیث، اصول فقہ اور رد مبتدعین مثلاً رد جہمیہ پر رسائل موجود تھے، امام بخاری نے ان تمام مدونہ علوم پر غور کیا اور جزئیات و کلیات کی تنقید کی پھر ان علوم کا ایک حصہ کہ جس کو انھوں نے بصراحت یا بدالالت ان صحیح حدیثوں میں پایا کہ جو بخاری کی شرط پر تھیں، اسے اپنی کتاب میں درج کیا، تاکہ ان علوم کی بنیادی چیزوں کے متعلق مسلمانوں کے ہاتھ میں ایسی جت قاطع موجود رہے کہ جس میں تشکیک کا دخل نہ ہو۔“

امام بخاری نے ان تمام مختلف فنون کو اپنی کتاب میں بالاختصار جمع کر کے جہاں اسے ایک مختصر جامع بنایا، وہاں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس میں انھوں نے صرف صحیح حدیثوں کے درج کرنے کا اہتمام کیا۔

حافظ ابن عدی بسند متصل امام بخاری سے ناقل ہیں کہ

ما أدخلت في كتابي الجامع إلا ما صح وتركت من الصحيح

حتى لا يطول. (۱)

”میں نے اپنی کتاب ”الجامع الصحیح“ میں صرف وہی حدیثیں

داخل کی ہیں، جو صحیح ہیں اور بہت سی صحیح احادیث کو اس لئے

چھوڑ دیا کہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔“

یہ کتاب حسب تصریح امام ممدوح چھ لاکھ احادیث کا انتخاب ہے، جو سولہ

سال کی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچا (۱) غایت احتیاط کا یہ عالم تھا کہ فرماتے ہیں ”میں نے کتاب الصحیح میں کوئی حدیث اس وقت تک درج نہیں کی، جب تک کہ لکھنے سے پہلے غسل کر کے دو گنا ادا نہ کر لیا اور اس کی صحت کا یقین نہ ہو گیا“ کتاب کی تصنیف کا

(۱) اگرچہ کتاب سولہ سال کی مدت میں تمام ہو گئی مگر نظر ثانی اور اضافہ کا سلسلہ آخر دم تک برابر جاری رہا، یہی وجہ ہے کہ فربری کے نسخہ میں جنہوں نے اس کو امام بخاری سے بعد میں سنا ہے، حماد بن شاکر کے نسخہ سے دوسو اور ابراہیم بن معقل کے نسخہ سے تین سو حدیثیں زیادہ مروی ہیں (تدوین الراوی، ص ۳۰)

صحیح بخاری کے موجودہ نسخہ میں جو حدیث اور ترجمہ الباب میں بہت سے مقامات پر نسخہ رطلی اور سوء ترتیب نظر آتی ہے اور جس کی شکایت شاہ ولی اللہ نے اپنے مکتوبات (ص ۱۷۱) میں بایں الفاظ کی ہے کہ ”در عقد تراجم سوء ترتیب و تقریر اور در میان بی آید..... اہل علم راجح نظر مطالب علیہ می باشد نہ تراجم و ترتیب، شعر

شیخ صاف از باشد گوشتال درو باش رندے آشام رہا ایں تکلفا چہ کار

اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ بعض مقامات پر امام ممدوح نے اضافہ کرنا چاہا تھا، مگر اس کا موقع نہ مل سکا، چنانچہ کہیں باب قائم کر لیا تھا، مگر اس کے تحت حدیث درج کرنے کی نوبت نہ آئی، کہیں حدیث لکھ لی تھی لیکن باب قائم نہ کر سکے تھے، بہر حال کتاب کے بہت سے مقامات اسی طرح تشنہ تکمیل ہی تھے کہ امام بخاری نے اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی، بعد کونا تئیں نے اپنی صوابدید کے مطابق جن ابواب میں چاہا، ان حدیثوں کو نقل کر دیا، چنانچہ حافظ ابوالولید باجی، اپنی کتاب اسماء رجال البخاری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ

”ہم سے حافظ ابو ذر ہروی نے بیان کیا کہ ہمیں ابوالحسن مستملی نے بتایا کہ میں صحیح بخاری کو اس کے اصل نسخہ سے جو فربری کے پاس موجود تھا نقل کیا، تو میں نے دیکھا کہ اس میں بعض چیزیں تو نا تمام ہیں اور بعض چیزوں کی تمییز ہو چکی ہے، چنانچہ بعض تراجم ابواب ایسے تھے کہ ان کے بعد کچھ درج نہ تھا اور بعض حدیثیں ایسی تھیں کہ ان پر ابواب نہ تھے، پھر ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیا۔“

باجی کہتے ہیں کہ اس بیان کی صحت کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ ابوالحسن مستملی، ابو محمد سرخسی، ابوالہشتم کشمیری اور ابو زید مروزی نے جو صحیح بخاری کی روایتیں کی ہیں، ان سب کی روایتوں میں باہم تقدیم و تاخیر کا اختلاف ہے، حالانکہ اصل نسخہ جس سے سب نے نقل کیا ایک ہی ہے، یہ اختلاف اس لئے ہوا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

آغاز بیت الحرام میں ہوا، ابواب و تراجم مسجد نبوی میں منبر شریف اور روضہ اقدس کے درمیان لکھے، (۱) اس محنت اور جانفشانی کے بعد کل حدیثیں جو درج کتاب ہیں، ان سب کی مجموعی تعداد بشمول مکررات و معاملات و متابعات نو ہزار بیاسی ہے (۲)، یہ تعداد اگرچہ امام بخاری کو جس قدر صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں (۳)، ان کے دسویں حصہ کے بھی برابر نہیں، لیکن امام موصوف کے حسن انتخاب کا بہترین نمونہ ہے، حافظ ابو جعفر عقیلی نے تصریح کی ہے کہ امام بخاری نے جب کتاب الصحیح تصنیف فرمائی، تو اسے علی ابن المدینی، احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین (۴) وغیرہ کی خدمت میں پیش کیا، ان سب حضرات نے اس کتاب کی تحسین کی اور اس کے صحیح ہونے کی شہادت دی، البتہ چار احادیث کی بابت اختلاف کیا، لیکن عقیلی کا بیان ہے کہ ان چار کے بارے میں بھی

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) کہ ہر ایک نے جو کچھ کتاب کے حاشیہ پر یا اس کے ساتھ کسی پرچہ پر لکھا ہوا پایا، اس کو اپنے اندازے سے کہ یہ عبارت غلطی جگہ کی ہونی چاہئے، اسی جگہ نقل کر دیا، چنانچہ یہ چیز اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دو اور دو سے زائد ترجمہ الباب یکجا لکھے ہوئے ہیں مگر ان میں حدیثیں نہیں ہیں۔ باجی کا بیان ہے کہ یہ چیز میں نے یہاں اس لئے ذکر کی کہ ہمارے اہل وطن ایسے معنی کے دھن میں لگے رہتے ہیں کہ جس سے ترجمہ الباب اور حدیث میں باہمی رابطہ قائم ہو سکے اور وہ اس سلسلہ میں بیجا تاویلات کی بلا وجہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔“ (مقدمہ فتح الباری، ج ۱ ص ۶ طبع میرہ مصر)

(۱) یہ سب تفصیل مقدمہ فتح الباری (ج ۲ ص ۴۹۰) میں مذکور ہے۔

(۲) اور بحذف مکررات کل تعداد دو ہزار سات سو اکٹھ ہے (مقدمہ فتح الباری)

(۳) چنانچہ حافظ ابو بکر حازمی نے سند متصل امام بخاری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ احفظ مائۃ الف حدیث صحیح (شروط الامۃ الثمۃ ص ۲۸ طبع مصر) مجھے ایک لاکھ حدیثیں زبانی یاد ہیں، یہ بھی خیال رہے کہ یہ تعداد تمام صحیح حدیثوں کی نہیں بلکہ صرف امام بخاری کی محفوظات کا شمار ہے۔

(۴) یہ وہ حضرات ہیں جن کے بارے میں خود امام بخاری نے جزار فی المیدین (ص ۵۵ طبع لاہور ۱۳۵۹ھ)

میں تصریح کی ہے کہ هؤلاء اهل العلم من اهل زمانهم یہ لوگ اپنے زمانے کے علماء تھے۔

امام بخاری ہی کا فیصلہ درست ہے اور وہ چاروں بھی صحیح ہیں (۱)

امام بخاری سے اس کتاب کو اگرچہ ہزاروں آدمیوں نے سنا تھا، لیکن امام موصوف کے جن تلامذہ سے صحیح بخاری کی روایت کا سلسلہ چلا، وہ یہ چار بزرگ ہیں: (۱) ابراہیم بن معقل بن الحجاج النسفی المتوفی ۲۹۳ھ، (۲) حماد بن شاکر النسفی المتوفی ۳۱۱ھ، (۲) محمد بن یوسف القریبری المتوفی ۳۲۰ھ، (۴) ابوطلحہ منصور بن محمد بن علی بن قرینہ البز دوی المتوفی ۳۲۹ھ، ان میں اول الذکر دونوں بزرگ مشہور حنفی عالم ہیں اور ابراہیم بن معقل ان سب میں اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ وہ حافظ الحدیث بھی تھے (۳)، حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے شروع میں اپنا سلسلہ سندان چاروں حضرات تک بیان کر دیا ہے، فرہرتی نے امام بخاری سے کتاب الصحیح کا دوبار

(۱) مقدمہ فتح الباری۔ (۲) حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں النسفی کی بجائے حماد بن شاکر النسوی لکھا ہے، لیکن علامہ کوثری نے تصریح کی ہے کہ صحیح النسفی ہی ہے اسی طرح ان کی وفات کی بابت بھی حافظ صاحب یہ لکھتے ہیں کہ اظنہ مات فی حدود التسعین یعنی ”میرے خیال میں ان کی وفات ۲۹۰ھ کے لگ بھگ ہوئی ہے“، لیکن محدث کوثری نے حافظ ابن نبط کی التفتید کے حوالہ سے جزاً لکھا ہے کہ ان کا سنہ وفات (۳۱۱ھ) ہے، سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس شرح قاموس میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے (وحماد بن شاکر بن سوہ) أبو محمد الوراق القسوی الحنفی (الراوی صحیح البخاری عنہ) أي عن البخاری نفسه (فصل السین من باب الواو والباء) اس عبارت میں بھی النسفی غلط طبع ہو گیا ہے۔

(۳) یہ بہت بڑے علامہ اور نہایت نامور مصنف گزرے ہیں، حافظ ہونے کے ساتھ فقہ بھی تھے اور اختلاف مذاہب میں گہری بصیرت رکھتے تھے، محاسن علیہ کے ساتھ زہد و تقویٰ اور ورع و عفاف سے بھی متصف تھے، آپ کی تصنیفات میں المسند الکبیر اور التفسیر کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے، حافظ عبد القادر قرشی نے الجواهر المضیة فی طبقات الحنفیة میں ان کا تذکرہ لکھا ہے اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ ان لفظوں میں شروع کیا ہے: ابراہیم بن معقل بن الحجاج الحافظ العلامة أبو إسحاق النسفی قاضی نسف وعالمها ومصنف المسند الکبیر والتفسیر وغیر ذلک (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سماع کیا ہے، ایک بار ۲۴۸ھ میں اپنے وطن فربر میں جب امام مدوح وہاں تشریف لائے ہوئے تھے اور دوسری بار ۲۵۲ھ میں خود بخارا میں جا کر۔

صحیح مسلم

امام مسلم نے اپنی جامع صحیح کا انتخاب تین لاکھ ایسی روایات سے کیا ہے کہ جن کو انھوں نے خود براہ راست اپنے شیوخ سے سنا تھا، (۱) پھر جمع صحیح میں نہ صرف یہ کہ اپنی ذاتی تحقیق پر اکتفا نہ کی، یعنی یہ نہیں کیا کہ جن حدیثوں کو خود انھوں نے صحیح سمجھا تھا، نقل کر دیا بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر صرف وہی حدیثیں درج کیں کہ جن کی صحت پر اور مشائخ وقت کا بھی اتفاق تھا، چنانچہ خود ان کا بیان ہے کہ

لیس کل شیء عندی صحیح وضعته ههنا إنما وضعت ههنا ما أجمعوا عليه (صحیح مسلم، باب التّشہد فی الصلوٰۃ)

”ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی، اس کو میں نے یہاں درج نہیں کیا، میں نے تو یہاں صرف ان حدیثوں کو درج کیا

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اور حافظ مستغفری کی ان کے بارے میں یہ الفاظ ہیں: کان فقیہاً حافظاً بصیراً باختلاف العلماء عقیفاً صیناً، حافظ ظلی فرماتے ہیں ہو حافظ ثقة اور حافظ ابن حجر، فتح الباری کے شروع میں لکھتے ہیں وکان من الحفاظ وله تصانیف۔

(۱) محدث حاکم نیشاپوری نے اس کو بالاسناد خود امام مسلم سے نقل کیا ہے، درمیان میں روایت صرف یہ دو ہیں: حافظ ابوعلی حسین بن محمد ماسر جسی اور ان کے والد (تذکرۃ الحفاظ ذہبی، ترجمہ ابوعلی ماسر جسی) یہ بھی واضح رہے کہ یہ امام مسلم کی کل معلومات حدیث کا شمار نہیں، بلکہ صرف مسعود روایات کا بیان ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ علم حدیث کی سیکڑوں کتابیں جو ان کی نظر سے گزری ہوں گی اور جن کی روایات پر بطور وجاہہ ان کو اطلاع ہوئی ہوگی، ان کی تعداد ان سے کہی گئی نہیں تو دو گنی کے قریب قریب ضرور ہوگی، یہ بھی یاد رہے کہ یہ تعداد طرق و اسانید کی ہے، متون کی نہیں۔

ہے کہ جن کی صحت پر شیوخ وقت کا اجماع ہے۔“

شیخ ابن صلاح وغیرہ نے اجماع سے اجماع عام سمجھا، اس لئے ان کو امام مسلم کے اس دعوے کی صحت کے متعلق سخت اشکال ہوا، (۱) لیکن امام مسلم کی مراد اجماع سے اجماع عام نہیں بلکہ اس دور کے بعض خاص مشہور شیوخ وقت کا اجماع ہے (۲) چنانچہ علامہ بلقینی نے اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، عثمان بن ابی شیبہ اور سعید بن منصور خراسانی ان چار ائمہ حدیث کے نام گنا کر لکھا ہے کہ امام مسلم کی مراد اجماع سے ان حضرات کا اجماع ہے۔ (۳)

امام مسلم نے اس پر بھی بس نہیں کیا، بلکہ جب کتاب مکمل ہو گئی، تو حافظ عصر ابو زرعی کی خدمت میں لیجا کر پیش کی، جو اس دور میں علل حدیث اور فن جرح و تعدیل کے بہت بڑے امام مانے جاتے تھے اور جس روایت کے بارے میں انھوں نے کسی علت کی طرف اشارہ کیا، اسے کتاب سے خارج کر دیا، اس طرح پندرہ سال کی محنت

(۱) ملاحظہ ہو مقدمہ شرح صحیح مسلم از علامہ نووی۔

(۲) اسی قسم کا اجماع وہ ہے جس کا ذکر امام اسحاق بن راہویہ کرتے ہیں کہ میں جب عراق میں تھا تو احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور دیگر اصحاب کے ساتھ نشست و برخاست رہتی، حدیثوں کا مذاکرہ چمڑا اور ایک ایک روایت کی دودو، تین تین سندیں پیش کرتے جاتے، پھر سب کے سچ میں سے یحییٰ بن معین فرماتے کہ اور یہ سند بھی تو ہے، جب اسانید و طرق کا مرحلہ طے ہو چکا تو میں کہتا کہ الیس قد صحت هذا إجماع منا (کیا یہ حدیث ہم سب کے اجماع سے صحیح نہیں ہوئی) اور سب بالاتفاق کہتے کہ جی ہاں، اب میں پوچھتا کہ مائتفسرہ، ما فقیہہ (اس کا مطلب کیا ہے اور اس میں فقہ کیا ہے) اس پر سب لوگ بجز احمد بن حنبل کے رک جاتے تھے، اس واقعہ کو ابن ابی حاتم نے حافظ احمد بن سلمہ سے انھوں نے خود اسحاق بن راہویہ سے سنا ہے۔ (ملاحظہ ہو، ترجمہ: الامام احمد بن تاریخ الاسلام للذہبی، ص ۱۵، طبع دار المعارف، مصر ۱۳۶۵ھ)۔

(۳) تدریب الراوی ص ۲۸۔

شاقہ میں یہ بارہ ہزار (۱) احادیث صحیحہ کا ایسا منتخب مجموعہ تیار ہوا جس کے بارے میں خود مصنف نے جوش ادعا میں کہا تھا۔

لو أن أهل الحديث يكتبون مائتي سنة الحديث فمدارهم على هذا المسند يعني صحيحه (۲)

”محمد ثین اگر دو سو سال تک بھی حدیثیں لکھتے رہیں، جب بھی

ان کا دار مدار اسی المسند الصحيح پر رہے گا،“

مردانِ خدا کی بات بے اثر نہیں ہوتی، آج دو سو برس کیا! گیارہ سو برس سے

زیادہ گزر گئے مگر کتاب کا حسن قبول اسی طرح پر ہے، سچ ہے ع

چراغ مقبلاں ہر گز نہیں

حافظ مسلمہ بن قاسم قرطبی نے اپنی تاریخ میں صحیح مسلم کے متعلق لکھا ہے کہ

لم يضع أحد في الإسلام مثله (۳)

”اسلام میں کسی نے ایسی کتاب تصنیف نہیں کی۔“

اور محدث قاضی عیاض نے الالماع میں ابو مروان طبری سے نقل کیا ہے کہ

”میرے بعض شیوخ صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر فضیلت دیتے تھے“ (۴) شیخ ابو محمد تجیبی نے

اپنی فہرست میں امام ابن حزم ظاہری کے متعلق بھی یہی لکھا ہے کہ وہ مسلم کی کتاب کو

بخاری کی کتاب پر ترجیح دیا کرتے تھے، (۵) اور حافظ ابن مندہ فرماتے ہیں کہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ، ترجمہ امام مسلم، یہ تعداد بشمول مکررات ہے، اگر مکررات کو شمار نہ کیا جائے تو کل حدیثوں کی تعداد چار ہزار کے قریب ہوتی ہے (تذریب الراوی، ص ۳۰)

(۲) مقدمہ شرح صحیح مسلم از نووی۔ (۳) و (۴) و (۵) مقدمہ فتح الباری، فصل ثانی۔

سمعت أبا علي النيسابوري يقول ومارأيت أحفظ منه ماتحت

أديم السماء أصح من كتاب مسلم. (۱)

”میں نے ابوعلی نیشاپوری کو جن سے بڑھ کر حافظ حدیث میری

نظر سے نہیں گزرا، یہ کہتے سنا ہے کہ آسمان کے تلے مسلم کی

کتاب سے صحیح تر کوئی کتاب نہیں۔“

حافظ ابن مندہ نے جس انداز میں ابوعلی نیشاپوری کی یہ تصریح نقل کی ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کی بھی یہی رائے ہے، یہ ابوعلی فن حدیث میں حاکم

(۱) حافظ ذہبی نے اس کو ابن مندہ سے باسناد متصل نقل کیا ہے (ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ، ترجمہ حافظ ابوعلی حسین بن

علی نیشاپوری) واضح رہے کہ صحیح مسلم کی اصحیح کے بارے میں جیسی تصریح حافظ ابوعلی نیشاپوری سے منقول ہے،

ایسی صحیح بخاری کے متعلق قدما و محدثین میں کسی سے مروی نہیں، البتہ محدث نووی نے شرح صحیح مسلم کے مقدمہ میں

امام نسائی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ما فی هذه الكتب كلها أجود من كتاب البخاري

”ان ساری کتابوں میں بخاری کی کتاب سے زیادہ خوب کوئی کتاب نہیں۔“

لیکن امام نسائی نے اجود (بہت خوب) کا لفظ استعمال کیا ہے، اصح کا نہیں، ہمارے خیال میں یہ صحیح

بخاری کی جامعیت اور حسن اختصار کی خوبی کا بیان ہے، مگر حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ۔

والنسائي لا يعني بالجودة إلا جودة الأسانيد ”نسائی کی مراد جودت سے صرف

جودت اسانید ہے۔“

بے شبہ جودت سے جودت اسانید اور جودت مضامین دونوں مراد لئے جاسکتے ہیں، اس لئے

ناظرین کو اختیار کہ وہ ہماری رائے سے اتفاق کریں یا حافظ صاحب کی بات مانیں مگر اتنا خیال رہے کہ امام

نسائی نے صحیح بخاری کے رواۃ میں سے ایک جماعت کو کتاب المفعفاء والمتر وکین میں داخل کیا ہے اور حدیث

ابن عمر کیف بک إذا عصرت بین قوم یحبون رزق سنتهم (الحدیث) کو جو حماد بن شاکر کے نسخہ

میں مروی ہے، موضوع بھی کہا ہے (ملاحظہ ہو ”التعقیبات علی الموضوعات“ از سیوطی ص ۳۳ طبع

علوی لکھنؤ ۱۳۰۳ھ)۔

نیشاپوری صاحب المستدرک علی الصحیحین کے استاذ ہیں، حاکم نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ”وہو وأحد عصره فی الحفظ والإتقان والورع والمذاكرة والتصنيف“ (۱) (یہ حفظ حدیث، مہارت فن، اتقان اور مذاکرہ و تصنیف میں یگانہ روزگار تھے۔)

صحیح مسلم کی شہرت اگرچہ مصنف سے تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے لیکن اس کی روایت کا سلسلہ جس بزرگ کے دم سے قائم رہا، وہ مشہور فقیہ حنفی شیخ ابوالحسن ابراہیم بن محمد بن سفیان نیشاپوری (۲) المتوفی ۳۰۸ھ ہیں، چنانچہ علامہ نووی مقدمہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

وأما من حيث الرواية المتصلة بالإسناد المتصل فقد انحصرت طريقته في هذه البلدان والأزمان في رواية أبي إسحق إبراهيم بن محمد بن سفين عن مسلم.

”اور اسناد متصل کے ساتھ امام مسلم سے اس کی مسلسل روایت

(۱) تذکرۃ الحفاظ ذہبی، ترجمہ ابوالحسن نیشاپوری۔

(۲) یہ مشہور زاہد، فقیہ ابوبن الحسن نیشاپوری حنفی کے خواص اصحاب میں سے ہیں، جنہوں نے فتنہ کی تحصیل امام محمد سے کی تھی، بڑے عابد زاہد اور مستجاب الدعوات تھے فن حدیث کی تحصیل حجاز، نیشاپور، رے اور عراق میں کی تھی۔ محدث حاکم نیشاپوری لکھتے ہیں: کان ابراہیم بن سفیان من العباد المجتہدین، ومن الملازمین لمسلم بن الحجاج وكان من أصحاب أبي بن الحسن الزاهد صاحب الرأي يعني الفقيه الحنفی، سمع ابراہیم بن سفیان بالحجاز ونيسابور والري والعراق، محدث نووی نے مقدمہ شرح مسلم میں ان کا ذکر ان الفاظ سے شروع کیا ہے: السيد الجليل أبو إسحق إبراهيم بن محمد بن سفیان الفقيه الزاهد المجتهد العابد، حاکم نے اپنے شیخ محمد بن یزید العدل سے نقل کیا ہے کہ یہ مستجاب الدعوات تھے، ابو عمرو بن نجید کہتے ہیں: کان من الصالحين، حافظ قرشی نے بھی الجواهر المعیہ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔

کا سلسلہ ان بلاد میں اور ان زمانوں میں صرف ابوالحق ابراہیم

بن محمد بن سفیان کی روایت میں منحصر ہے۔“

ابراہیم بن سفیان کو امام مسلم سے خاص ربط تھا، اکثر حاضر خدمت رہتے، ان کا بیان ہے کہ امام مسلم نے اس کتاب کی قرأت سے جو انھوں نے ہمارے لئے شروع کی تھی، رمضان ۲۵ھ میں فراغت پائی، یوں بلاد مغرب میں امام ممدوح کے ایک اور شاگرد ابو محمد احمد بن علی قلانی سے بھی صحیح مسلم کی روایت کی جاتی تھی لیکن اس کا سلسلہ مغرب کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا اور جو قبول عام ابراہیم نیشاپوری کی روایت کو نصیب ہوا وہ قلانی کی روایت کو نہ ہوسکا، علاوہ ازیں صحیح مسلم کا آخری حصہ جو تین جزء کے قریب قریب ہے، ابو محمد قلانی نے امام مسلم سے براہ راست نہیں سنا، بلکہ وہ اس کو ابراہیم کے شاگرد ابو احمد جلودی سے روایت کرتے ہیں۔ (۱)

سنن نسائی

امام نسائی نے بھی اپنی سنن میں امام بخاری و امام مسلم کی طرح صرف صحیح الاسناد روایات ہی کو لیا ہے، ان کی تصنیف بخاری و مسلم دونوں کے طریقوں کی جامع سمجھی جاتی ہے اور علل حدیث کا بیان اس پر مستزاد ہے، اس کے ساتھ حسن ترتیب اور جود تالیف میں بھی ممتاز ہے، چنانچہ حافظ ابو عبد اللہ بن رشید المتوفی ۷۲۱ھ فرماتے ہیں کہ

إنه أبداع الكتب المصنفة في السنن تصنيفاً وأحسنها

(۱) مقدمہ شرح مسلم از نووی۔

ترصیفاً وهو جامع بین طریقتی البخاری و مسلم مع حظ

کثیر من بیان العلل. (۱)

”یہ کتاب علم سنن میں جس قدر کتابیں تالیف ہوئیں ہیں، ان سب میں تصنیف کے لحاظ سے انوکھی اور ترتیب کے اعتبار سے بہترین ہے اور یہ بخاری و مسلم دونوں کے طریقوں کی جامع ہے، نیز علل حدیث کے بھی ایک خاص حصہ کا اس میں بیان آگیا ہے۔“

صحت کے بارے میں خود امام نسائی کا بیان ہے کہ

کتاب سنن صحیح کله (۲) ”کتاب سنن تمامتر صحیح ہے“

اس کے رجال کی جب محدثین نے جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ تنقید رجال اور صحت اسناد کے بارے میں امام نسائی کے شرائط امام بخاری و امام مسلم سے بھی زیادہ سخت ہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

فکم من رجل أخرج له أبو داود والترمذي وتجنب النسائي

إخراج حديثه بل تجنب النسائي إخراج حديث جماعة من

رجال الصحيحين (۳)

”بہت سے ایسے اشخاص ہیں کہ جن سے ابو داؤد اور ترمذی نے

روایتیں لی ہیں، مگر امام نسائی نے ان کی روایتوں سے احتراز

(۱) مقدمہ ہر الربی علی النبی، از سیوطی، و فتح المغیث از سخاوی۔

(۲) و (۳) مقدمہ ہر الربی۔

فرمایا ہے بلکہ امام نسائی نے تو صحیحین تک کے راویوں کی ایک جماعت سے حدیث کی تخریج میں اجتناب کیا ہے۔“

اور حافظ ابوالفضل بن طاہر مقدسی، شروط الائمة السّنة میں لکھتے ہیں کہ میں نے امام ابوالقاسم سعد بن علی زنجانی سے مکہ معظمہ میں ایک راوی کا حال دریافت کیا، انھوں نے اس کی توثیق کی، میں نے عرض کیا کہ امام عبدالرحمن نسائی نے اس کی تضعیف کی ہے، اس پر امام موصوف نے فرمایا کہ

يا بُنَيَّ اِنَّ لابي عبدالرحمن في الرجال شرطاً اشد من شرط البخاري ومسلم (۱)

”بیٹا رجال کے بارے میں ابوعبدالرحمن (امام نسائی) کی شرط بخاری و مسلم کی شرط سے بھی زیادہ سخت ہے۔“

اسی بنا پر حافظ محدث امام ابوالحسن معافری التوفی ۴۰۳ھ جو محدث دارقطنی اور حاکم کے معاصر ہیں، فرماتے ہیں کہ

اذا نظرت إلى ما يخرج به أهل الحديث فما خرج به النسائي أقرب إلى الصحة مما خرج به غيره. (۲)

”جب تم محدثین کی روایت کردہ حدیثوں پر نظر ڈالو گے، تو جس حدیث کی امام نسائی نے تخریج کی ہوگی، وہ دوسروں کی روایت کردہ حدیث کی بہ نسبت صحت کے زیادہ قریب ہوگی۔“

(۱) شروط الائمة السّنة ص ۱۸ طبع مصر۔

(۲) مقدمہ زہر الرئی، از علامہ سیوطی۔

اور اسی لئے مغرب کے بعض محدثین صحیح بخاری پر اس کی ترجیح کے قائل ہیں، چنانچہ حافظ شمس الدین سخاوی، فتح المغیث میں لکھتے ہیں:

صرح بعض المغاربة بتفضیل کتاب النسائي علی
صحیح البخاري (۱)

”بعض مغاربہ نے تصریح کی ہے کہ امام نسائی کی کتاب کو صحیح
بخاری پر فضیلت حاصل ہے“

بلکہ محدث ابن الاثر نے تو اپنے بعض کی شیوخ سے یہاں تک نقل
کر دیا ہے کہ

انه أشرف المصنفات كلها وما وضع في الإسلام مثله. (۲)
”یہ (اس فن کی) تمام تصنیفات سے بڑھ چڑھ کر ہے اور اسلام
میں اس کے مثل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔“

ناقدین فن کے نزدیک جلالت علمی کے اعتبار سے امام نسائی کا پایہ امام مسلم
سے بھی بڑھا ہوا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی، مقدمہ فتح الباری میں رقمطراز ہیں:

قدمه قوم من الحذاق في معرفة ذلك علی مسلم بن
الحجاج، وقدمه الدار قطني وغيره في ذلك، وغيره علی
إمام الأئمة أبي بكر خزيمة صاحب الصحيح (۳)

”فن رجال میں ماہرین فن کی ایک جماعت نے ان کو امام

(۱) ص ۱۲ طبع انوار محمدی لکھنؤ۔ (۲) فتح المغیث ص ۳۳۔

(۳) ہدی الساری مقدمہ فتح الباری، ج ۸ ص ۸ طبع میریہ مصر۔

مسلم بن الحجاج پر بھی فوقیت دی ہے اور دارقطنی وغیرہ نے ان کو اس فن میں اور دیگر علوم حدیث میں امام الائمہ ابو بکر بن خزیمہ صاحب الصحیح پر بھی مقدم رکھا ہے۔“
اور حافظ شمس الدین ذہبی، سیر أعلام النبلاء میں امام نسائی کے ترجمہ میں فرماتے ہیں کہ

هو أحلق بالحديث وعلله ورجاله من مسلم
والترمذي وأبي داود، وهو جارف مضمار
البخاري وأبي زرعة (۱)

”یہ مسلم، ترمذی، اور ابو داؤد سے حدیث، علل حدیث اور علم الرجال میں زیادہ ماہر ہیں اور بخاری و ابو زرعة کے ہمسر ہیں۔“
اور علامہ تاج الدین سبکی، طبقات الشافعية الكبرى میں لکھتے ہیں:
”میں نے اپنے شیخ حافظ ابو عبد اللہ ذہبی سے سوال کیا کہ آیا امام مسلم بن الحجاج حدیث کے زیادہ حافظ ہیں یا امام نسائی؟
فرمایا، امام نسائی، پھر شیخ امام والد (حافظ تقی الدین سبکی) سے،
(اللہ تعالیٰ ان پر رحمتیں نازل فرمائے) اس کا ذکر کیا، تو انھوں نے اس موافقت کی۔“ (۲)

امام نسائی سے ان کی کتاب السنن کو جن حضرات نے روایت کیا ہے، ان

(۱) توضیح الافکار از محدث امیر ایمانی، ج ۱ ص ۲۲۰ طبع مصر۔

(۲) کتاب مذکور میں امام نسائی کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

- (۱) امام ممدوح کے صاحبزادے عبدالکریم (۲) حافظ ابو بکر احمد بن محمد بن اسحاق الدینوری المعروف بابن السنی المتوفی ۳۶۳ھ (۳) ابو علی الحسن بن خضر الاسیوطی (۴) الحسن بن رشیق العسکری (۵) حافظ ابو القاسم حمزہ بن محمد بن علی الکنانی المتوفی ۳۵۷ھ (۶) ابو الحسن محمد بن عبد اللہ بن زکریا بن حبویہ (۷) محمد بن معاویہ بن الاحمر (۸) حافظ ابو عبد اللہ محمد بن قاسم بن محمد بن قاسم البنانی الاموی القرطبی المتوفی ۳۲۸ھ (۹) امام ابو الحسن علی بن احمد طحاوی المتوفی ۳۵۱ھ (۱۰) احمد بن محمد بن المہندس۔

ان رواد مذکورین میں امام ابو الحسن علی طحاوی المتوفی ۳۵۱ھ اکابر فقہاء حنفیہ میں سے ہیں اور بڑے پایہ کے محدث گزرے ہیں، یہ مشہور امام وقت ابو جعفر طحاوی کے صاحبزادے ہیں، جن کی ”شرح معانی الآثار“ علم حدیث میں ایک بے مثل کتاب ہے اور نہایت مشہور و متداول ہے۔ (۱)

یہ بھی واضح رہے کہ بالفعل جو کتاب ”سنن نسائی“ کے نام سے ہمارے

(۱) امام ابو الحسن طحاوی کو فقہ حدیث، لغت، نحو وغیرہ مختلف علوم میں امامت کا درجہ حاصل تھا، نہایت متقی اور زاہد تھے، علامہ ابوالحسن ابن ثعربی نے النجوم الزاہرہ میں ان کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

کان إمام عصره بلا مدافعة في الحديث والفقه واختلاف العلماء والأحكام واللغة والنحو وصنف المصنفات الحسان، وكان من كبار فقهاء الحنفية.

”یہ حدیث، فقہ، اختلاف علماء، علم احکام، لغت اور نحو میں بلا مقابلہ اپنے وقت کے امام

تھے، انھوں نے نہایت عمدہ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں اور یہ کبار فقہاء حنفیہ میں سے ہیں“

حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواهر المصیۃ فی طبقات الحنفیہ میں اور فاضل کھنوی مولانا محمد عبدالحی فرنگی بھلی

نے التعليقات السنية على الفوائد البهية میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔

یہاں داخل درس ہے وہ دراصل امام موصوف کی تصنیف نہیں، بلکہ ان کی کتاب کا اختصار ہے، جو ان کے نامور شاگرد حافظ ابو بکر بن السنی کے قلم کا مرہون منت ہے، اس مختصر کا نام المجتبیٰ ہے اور اس کو سنن صغریٰ بھی کہا جاتا ہے۔ (۱)

امام نسائی نے اپنی سنن میں امام ابو حنیفہؒ سے حسب ذیل روایت کی ہے۔
”حدثنا علي ابن حجر ثنا عيسى هو ابن يونس عن النعمان يعني أباحنيفة عن عاصم عن أبي رزین عن ابن عباس قال ليس علي من أئمة بهيمة حد“ یہ روایت ابن السنی کے اختصار میں نہیں ہے لیکن ابن الاثر، ابو علی سیوطی اور مغاربہ کے نسخوں میں موجود ہے۔ (۲)

سنن ابی داؤد

امام ابو داؤد سجستانی نے اپنی کتاب السنن کا انتخاب پانچ لاکھ احادیث کو سامنے رکھ کر کیا ہے، چنانچہ خود ان کا بیان ہے کہ:

(۱) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سنن صغریٰ خود امام نسائی کی تالیف ہے، اس خیال کی تائید میں اس واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے کہ امام نسائی نے جب سنن کبریٰ تصنیف فرمائی تو اس کو امیر رملہ کی خدمت میں لجا کر پیش کیا امیر موصوف نے امام مودع سے دریافت کیا کہ اس میں جو کچھ ہے سب صحیح ہے، امام نے جواب دیا نہیں، اس پر امیر نے فرمائش کی کہ میرے لئے صرف صحیح روایات کو جمع کر دیجئے، تب امام نسائی نے اس کے لئے سنن صغریٰ تصنیف فرمائی، اس واقعہ کا ذکر علامہ ابن الاثیر نے جامع الاصول میں کیا ہے لیکن یہ واقعہ سرے سے غلط ہے، چنانچہ حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں امام نسائی کے ترجمہ میں تصریح کی ہے کہ ان هذه الرواية لم تصح بل

المجتبیٰ اختصار ابن السنی تلمیذ النسائی (توضیح الافکار، ج ۱ ص ۲۳۱)

”بے شبہ یہ روایت صحیح نہیں بلکہ بھٹی، ابن السنی کا اختصار ہے جو نسائی کے شاگرد ہیں۔“

(۲) ملاحظہ ہو، تہذیب التہذیب، از حافظ ابن حجر عسقلانی، ترجمہ امام ابو حنیفہؒ

کتبت عن رسول الله ﷺ خمس مائة ألف حديث انتخبت

منها ما ضمنته هذا الكتاب (۱)

”میں نے رسول اللہ ﷺ کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں، جن

سے ان روایات کا انتخاب کیا ہے، جو اس کتاب میں درج کی ہیں۔“

یہ واضح رہے کہ دیگر مصنفین صحاح کی نسبت امام ابوداؤد پر فقہی ذوق زیادہ غالب تھا، چنانچہ تمام ارباب صحاح ستہ میں صرف یہی ایک بزرگ ہیں کہ جن کو علامہ شیخ ابواسحاق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں جگہ دی ہے، اور امام مدوح کے اسی فقہی ذوق کا یہ نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کو صرف احادیث احکام کے لئے مختص فرمایا، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں آپ کو دیگر کتب صحاح کی طرح زہد اور فضائل اعمال وغیرہ کی حدیثیں نہیں ملیں گی اور گواس بنا پر احادیث کے بہت سے ابواب سے یہ کتاب خالی ہے، لیکن فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے، صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں آپ کو نہیں ملے گا، چنانچہ امام حافظ ابو جعفر بن زبیر غرناطی التونی ۸۰۷ھ صحاح ستہ کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

ولأبي داؤد في حصر أحاديث الأحكام واستيعابها ما ليس

لغيره (۲)

(۱) مقدمہ تلخیص سنن ابی داؤد، از حافظ منذری، یہ کتاب مطبع انصاری دہلی میں غلیہ المقصود فی حل سنن ابی داؤد کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے اور چونکہ غلیہ المقصود کی صرف ایک جلد طبع ہو کر رہ گئی، اس لئے اس نادر کتاب کا صرف ابتدائی حصہ طبع ہوا ہے جو چند ابواب سے زائد نہیں ہے۔

(۲) تدریب الراوی ص ۵۶، مقدمہ زہر الربی علی المجتبیٰ، اور مقدمہ قوت المفتدی شرح

جامع الترمذی ۱۲

”اور احادیث فقہیہ کے حصر و استیعاب کے سلسلہ میں ابوداؤد کو

جو بات حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین صحاح ستہ کو نہیں۔“

خوش قسمتی سے چند سال ہونے آئے کہ محدث کوثری کے تحشیہ اور تعلیق کے ساتھ امام ابوداؤد کا وہ نادر رسالہ چھپ گیا کہ جس میں انھوں نے اپنی کتاب السنن کا تفصیلی تعارف کرایا ہے، یہ اہل مکہ وغیرہ کے ایک خط کا جواب ہے، جس میں انھوں نے کتاب السنن کی احادیث کے بارے میں امام موصوف سے استعواب رائے کیا تھا، ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں امام موصوف کے بیان کی جواہریت ہے وہ کسی اور چیز کی نہیں ہو سکتی کہ ع تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

چنانچہ اس رسالہ کا اقتباس بدیہ ناظرین ہے، امام ممدوح فرماتے ہیں:

”آپ لوگوں نے مجھ سے یہ دریافت کیا ہے کہ آپ کو میں یہ

بتاؤں کہ کتاب السنن میں جو حدیثیں ہیں، آیا یہ میرے علم کے

مطابق صحیح ترین حدیثیں ہیں؟ سو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ

سب ایسی ہی ہیں، الا یہ کہ وہ حدیث دو صحیح طریقوں سے مروی

ہو اور ان میں سے ایک کا راوی اسناد میں مقدم ہو، (یعنی اس کی

سند عالی ہو اور اس میں واسطے کم ہوں) اور دوسرے کا حفظ میں

بڑھا ہوا ہو، تو ایسی صورت میں کبھی اول الذکر طریقہ ہی کو لکھ دیتا

ہوں، حالانکہ میرے خیال میں مجھے ایسی دس حدیثیں بھی اپنی

کتاب میں معلوم نہیں ہوتیں اور میں نے باب میں صرف ایک یا

دو حدیثیں ہی نقل کی ہیں، گو اس باب کی اور صحیح حدیثیں بھی

موجود تھیں، کیونکہ اس صورت میں بہت کثرت ہو جاتی اور میرا مقصد یہ تھا کہ نفع جلد ہو، اور جب کسی باب میں کسی نے کسی حدیث کو دو یا تین طریقوں سے دہرایا ہے، تو اس سبب سے کہ اس میں کوئی بات زیادہ تھی اور کبھی اس میں دوسری احادیث کی بہ نسبت صرف ایک ہی لفظ زیادہ تھا اور بعض دفعہ میں نے ایک طویل حدیث کو مختصر اذکر کیا ہے، کیونکہ اگر اس کو پوری نقل کرتا تو بعض سامعین کو یہ بھی نہ چلتا اور اس میں جو فقہ کا مسئلہ تھا، وہ سمجھ ہی میں نہ آتا، لہذا اس کا اختصار کرنا پڑا۔

رہیں مرسل احادیث، سوان سے گذشتہ عہد کے علماء جیسے سفیان ثوری، مالک بن انس، اور اوزاعی حجت پکڑتے تھے، یہاں تک شافعی آئے اور انھوں نے ان پر کلام کرنا شروع کیا، اور احمد بن حنبل وغیرہ نے اس باب میں ان ہی کی اتباع کی، اللہ ان سب کو اپنی رضا نصیب کرے، سو جب کوئی مسند روایت، مرسل روایت کے خلاف موجود نہ ہو اور مسند روایت نہ پائی جائے تو ایسی صورت میں مرسل روایت کو بھی مانا جائے گا، لیکن وہ قوت میں متصل روایت کے برابر نہیں ہے۔

اور کتاب السنن جس کو میں نے تصنیف کیا ہے، اس میں کسی متروک الحدیث شخص سے کوئی روایت نہیں ہے، اور اگر اس میں کوئی منکر روایت آگئی ہے، تو میں نے اس کا منکر ہونا

بیان کر دیا ہے اور ایسا اس صورت میں ہوا ہے جبکہ اس باب میں اس کے علاوہ اور کوئی روایت نہ تھی۔

اور یہ وہ حدیثیں ہیں کہ ابن مبارک اور کتب کی کتاب میں ان میں سے بہت تھوڑی روایات ہیں، ان کی کتابوں میں زیادہ مراسل درج ہیں اور مالک بن انس کی کتاب السنن مؤطا میں اور اسی طرح حماد بن سلمہ اور عبد الرزاق کی مصنفات میں ان میں سے اچھی خاصی روایتیں آگئی ہیں، تاہم جیسا کہ میرا خیال ہے ان سب حضرات کی مجموعی کتابوں میں بھی یعنی مالک بن انس، حماد بن سلمہ اور عبد الرزاق کی تصنیفات کو ملا کر بھی اس کتاب کی تہائی روایتیں نہیں ہیں۔ (۱)

اور میری کتاب میں جو حدیث ایسی تھی کہ اس میں ذرا زیادہ کمزوری تھی، تو میں نے اس کو بیان کر دیا ہے اور اسی میں وہ روایت بھی آگئی کہ جس کی سند صحیح نہیں اور جس روایت کے بارے میں میں نے کچھ نہیں کہا، تو وہ ٹھیک ہے اور ان میں بعض

(۱) لیکن اس کے باوجود علامہ محمد بن ابراہیم وزیر یمنی، العواصم والقواصم فی الذب عن سنة أبي القاسم میں (جس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے) امام نووی سے نقل ہیں کہ
 إن أبا داود لم يستوعب الصحيح من أحاديث الأحكام ولا معظمه، وذلك ظاهر بل معرفة ضرورية لمن له أدنى اطلاع، انتهى.

”امام ابو داؤد سب احادیث احکام بلکہ بیشتر کو بھی نہیں لائے اور یہ ایک ظاہر چیز ہے، بلکہ اس کا علم تو اسے بھی ضرور ہو جاتا ہے جسے اس فن کی ذرا سی بھی خبر ہے۔“

بعض سے صحت میں بڑھی ہوئی ہیں، اور جو یہ کتاب میرے سوا کسی اور کی لکھی ہوتی، تو پھر میں اس کے بارے میں اس سے زیادہ کہتا، اور یہ ایسی کتاب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جو سنت بھی ٹھیک اسناد سے تمہیں ملے گی وہ اس میں موجود ہوگی لایہ کہ وہ کوئی ایسی بات ہو کہ جو حدیث سے استنباط کی گئی ہو۔

میرے علم میں قرآن کے بعد جتنا اس کتاب کا سیکھنا لوگوں پر لازم ہے، اتنا کسی اور چیز کا نہیں، اور اس کتاب کے لکھ لینے کے بعد اگر کوئی شخص علم کی کوئی اور چیز نہ لکھے، تو کچھ نقصان نہیں، جب کوئی شخص اس کتاب کو دیکھے گا اور اس میں غور کرے گا اور اس کو سمجھے گا، تب اس کو اس کی قدر معلوم ہوگی۔

اور یہ مسائل (یعنی ثوری، مالک اور شافعی کے مسائل)

سوان کی بنائے ہی احادیث پر ہے، تاہم مجھے یہ پسند ہے کہ اس کتاب کے ساتھ ساتھ صحابہ کے فتاوے کو بھی قلمبند کیا جائے، نیز کوئی ایسی کتاب بھی نقل کر لی جائے جیسی کہ سفیان ثوری کی جامع ہے کہ وہ ان سب جوامع میں جو لوگوں نے تصنیف کی ہیں، سب سے اچھی ہے۔

اور جو حدیثیں کہ میں نے کتاب السنن میں درج کی

ہیں، ان میں اکثر مشہور روایات ہیں جو ہر اس شخص کے پاس موجود ہیں کہ جس نے تھوڑا بہت بھی احادیث کو لکھا ہے لیکن اس

کو تیز کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

اور میں نے کتاب السنن میں صرف احکام ہی کو تصنیف کیا ہے، زہد اور فضائل اعمال وغیرہ کو تصنیف نہیں کیا، سو یہ چار ہزار آٹھ سو احادیث ہیں، جو سب کی سب احکام پر مشتمل ہیں۔“ (۱)

سنن ابی داؤد کی افادیت کے پیش نظر امام غزالی نے تصریح کی ہے کہ علم حدیث میں صرف یہی ایک کتاب مجتہد کے لئے کافی ہے، (۲) محدث زکریا ساجی کے الفاظ ہیں:

کتاب اللہ عز وجل اصل الإسلام، و کتاب السنن لأبی داؤد
عهد الإسلام (۳)

”اصل اسلام کتاب اللہ ہے، اور فرمان اسلام سنن ابی داؤد۔“
علامہ ابن حزم کا بیان ہے کہ ایک بار حافظ سعید بن سلک صاحب الصحیح التوفی ۳۵۳ھ کی خدمت میں اصحاب حدیث کی ایک جماعت حاضر ہوئی اور انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے حدیث کی بہت سی کتابیں آگئی ہیں، اگر شیخ اس سلسلہ میں کچھ ایسی کتابوں کی طرف ہم لوگوں کی رہنمائی کریں کہ جن پر ہم اکتفا کر سکیں، تو بہتر ہے، حافظ ابن سلک نے یہ سن کر کچھ جواب نہیں دیا بلکہ اٹھ کر سیدھے اندر گھر میں تشریف

(۱) ملاحظہ ہو، رسالہ مذکورہ از ص ۲ تا ص ۸ طبع قاہرہ ۱۳۶۹ھ۔ (۲) فتح المغیث از ستادی ص ۲۸۔

(۳) شروط الائمة السنن از ابن طاہر ص ۷، طبقات ابن السکبی، تذکرہ الحفاظ ذہبی، ان تینوں کتابوں میں عهد الاسلام مرقوم ہے لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان الحدیث میں اس کا ترجمہ ”سنن اسلام“ کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے اس کو عمد الاسلام پڑھا ہے۔

لے گئے اور کتابوں کے چار بستے لاکراوپر تلے رکھ دیئے، پھر فرمانے لگے:

هذه قواعد الإسلام، كتاب مسلم و كتاب البخاري و كتاب

أبي داؤد و كتاب النسائي (۱)

”یہ اسلام کی بنیادیں ہیں، کتاب مسلم، کتاب بخاری، کتاب

ابی داؤد اور کتاب نسائی۔“

اور حافظ ابو عبد اللہ بن منہ اپنے صحیح میں لکھتے ہیں:

الأئمة الأربعة الذين أخرجوا الصحيح وميزوا ثابته من

سقيمه، وخطاه من صوابه، هم البخاري ومسلم وأبو داؤد

والنسائي. (۲)

”وہ چار ائمہ کہ جنہوں نے صحیح حدیث کی تخریج کی اور ثابت کو

سقیم سے اور خطا کو صواب سے جدا کیا، یہ چار ہیں، بخاری،

مسلم، ابو داؤد، نسائی۔“

محدث حاکم نیشاپوری نے بھی سنن ابی داؤد کو صحیح بتایا ہے (۳) اور حافظ ابن

عبدالبر فرماتے ہیں کہ:

كل ما سكت عليه أبو داؤد فهو صحيح عنده. (۴)

”جس حدیث پر امام ابو داؤد کچھ کلام نہ کریں، وہ ان کے نزدیک صحیح ہے۔“

امام ابو داؤد نے کتاب السنن کی تکمیل بہت پہلے اپنے عہد شباب ہی میں

(۱) شروط الأئمة الستة ص ۱۶۔ (۲) تہذیب التہذیب میں عمرہ مولیٰ ابن عباس کا ترجمہ دیکھو۔

(۳) فتح المغیب ص ۳۳۔ (۴) ایضاً ص ۲۹، توضیح الآثار، ج ۲ ص ۱۹۷۔

کر لی تھی، یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ان کے شیخ امام احمد بن حنبلؒ زندہ تھے، امام ابو داؤدؒ نے جب یہ کتاب امام ممدوح کی خدمت میں لے جا کر پیش کی، تو امام ممدوح نے اس کو پسند فرمایا اور اس کی تحسین کی، (۱) تصنیف ہونے کے ساتھ ہی حق تعالیٰ نے اس کتاب کو جو قبول عام بخشا، وہ صحاح ستہ میں سے کسی کتاب کو نصیب نہ ہو سکا، چنانچہ امام موصوف کے شاگرد حافظ محمد بن مخلد دوری (۲) المتوفی ۳۳۱ھ کا بیان ہے کہ:

لما صنف السنن وقرأه على الناس صار كتابه لأهل الحديث
كالمصحف يتبعونه (تہذیب التہذیب ترجمہ امام ممدوح).

”جب انھوں نے کتاب السنن تصنیف کی اور اس کو لوگوں کے
سامنے پڑھا تو محدثین کے لئے ان کی کتاب قرآن کی طرح
قابل اتباع بن گئی۔“

اور امام احمد بن محمد ابوسلیمان خطابی المتوفی ۳۸۸ھ اپنی مشہور کتاب معالم
السنن شرح سنن ابی داؤد میں فرماتے ہیں:

إن كتاب السنن لأبي داؤد كتاب شريف لم يصنف في علم
الدين كتاب مثله وقد رزق القبول من الناس كافة، فصار
حكما بين فرق العلماء وطبقات الفقهاء على اختلاف

(۱) مقدمہ تلخیص مندرج ص ۵ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ امام ابی داؤد۔

(۲) یہ بڑے پایہ کے حافظ حدیث گزرے ہیں، محدث خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں ان کا نہایت مبسوط
ترجمہ لکھا ہے اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع کیا ہے الإمام المفید الثقة
محدث بغداد، حدیث میں امام ابوصنیف کی سند سب سے پہلے انہیں نے تصنیف کی ہے، جس کا نام جمع
حدیث ابی حنیفہ ہے، خطیب بغدادی نے اس کتاب کا ذکر تاریخ بغداد (ج ۲ ص ۱۸۸ طبع مصر) میں کیا ہے۔

مذاہبہم فلکل فیہ ورد، ومنہ شرب وعلیہ معول اہل العراق
واہل مصر وبلاد المغرب وکثیر من مدن اقطار الارض، فاما
اہل خراسان فقد اولع اکثرہم بکتاب محمد بن اسمعیل
ومسلم بن الحجاج ومن نحا نحوہما فی جمع الصحیح
علی شرطہما فی السبک والانتقاد الا ان کتاب ابی داؤد
احسن رصفا واکثر فقہا (۱)

”امام ابو داؤد کی کتاب السنن بلاشبہ ایسی عمدہ کتاب ہے کہ علم دین
میں ایسی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی، اور اس نے سب لوگوں کی
طرف سے سند قبولیت حاصل کی، چنانچہ یہ کتاب علماء کے تمام
فروق اور فقہاء کے سب طبقوں میں باوجود اختلاف مذاہب کے
حکم مانی جاتی ہے، سب لوگ اسی کے گھاٹ پر آتے اور یہیں سے
سیراب ہوتے ہیں، اسی پر اہل عراق، اہل مصر، بلاد مغرب اور
روئے زمین کے بہت سے شہروں کے رہنے والوں کو اعتماد ہے،
البتہ اہل خراسان میں بیشتر لوگ محمد بن اسمعیل، مسلم بن حجاج اور
ان لوگوں کی کتابوں کے دلدادہ ہیں کہ جو جمع صحیح میں ان دونوں
حضرات کے قدم بقدم چلے ہیں، اور جنہوں نے جانچ پڑتال میں
انہی شروط کو ملحوظ رکھا ہے، لیکن ابو داؤد کی کتاب ترتیب کے اعتبار
سے بہت اچھی اور فقہ کے لحاظ سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔“

امام ابو داؤد سے ان کی کتاب السنن کو حسب ذیل حضرات نے روایت کیا ہے، (۱) ابویعلیٰ محمد بن احمد بن عمرو ولولوتی (۲) ابوطیب احمد بن ابراہیم بن عبد الرحمن اشثانی (۳) حافظ ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد المعروف بابن الاعرابی المتوفی ۳۴۰ھ (۴) ابوبکر محمد بن عبد الرزاق بن داسہ المتوفی بعد ۳۴۵ھ، امام ابوبکر حصص خفی صاحب احکام القرآن، سنن ابی داؤد کو ان ہی سے روایت کرتے ہیں۔ (۱) (۵) ابوعمر و

(۱) امام حصص مشہور اکابر حنفیہ میں سے ہیں، بہت بڑے محدث اور امام تھے، فہن حدیث میں ان کو امام ابوالحسن کرخفی، ابوالعباس اصم، حافظ عبد الباقی بن قانع، اور ابوعمر غلام ثعلب سے تلمذ حاصل ہے، ۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے، طلب حدیث میں مختلف ممالک کا سفر کیا، ۳۲۵ھ میں بغداد آئے اور امام کرخفی سے فقہ و حدیث کی تعلیم حاصل کی پھر اسی سلسلہ میں اہواز گئے اور وہاں سے بغداد آئے، یہاں آکر امام کرخفی کے مشورہ سے محدث حاکم نیشاپوری کے ساتھ اس فن کی تکمیل کے لئے نیشاپور گئے، یہ ابھی نیشاپور ہی میں تھے، کہ امام کرخفی کا انتقال ہو گیا، نیشاپور سے ۳۳۳ھ میں بغداد کو واپس ہوئی اور پھر بیہیم کے ہو رہے، بغداد میں ان کی درس گاہ تمام عالم اسلامی کا مرجع تھی، نہایت زاہد، پاکباز تھے، بارگاہ خلافت سے ان کو بارگاہ عہدہ قضا پیش کیا گیا لیکن انھوں نے کسی قبول نہیں فرمایا، امام صمیری فرماتے ہیں:

استقر التدريس ببغداد لأبي بكر الرازي وانتهت الرحلة إليه، وكان على طريق من تقدمه في الورع والزهد والصيانة.

”بغداد میں ابوبکر رازی کے درس کا سلسلہ قائم ہوا اور علمی رحلت کی انتہا ان کے آستانہ

پر ہوئی، یہ زہد و ورع اور احتیاط میں متقدمین کے طرز پر تھے۔“

خطیب بغدادی کے ان کے بارے میں یہ الفاظ ہیں، کسان امام اصحاب ابی حنیفہ فی وقتہ و کسان مشہور بالزهد، حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المصنویہ میں ان کا ترجمہ ان لفظوں میں کیا ہے: احمد بن علی الرازی الإمام الكبير الشأن، ان کے حلقہ درس سے بڑے بڑے اکابر ائمہ پیدا ہوئے، جن میں امام ابوبکر محمد بن موسیٰ خوارزمی، امام ابو جعفر محمد بن احمد نسفی، امام ابو عبد اللہ محمد بن یحییٰ بن مہدی فقیہ جرجانی، استاذ امام قدوری، امام ابو الفرج احمد بن محمد بن عمر المعروف بابن المسلمہ، امام ابو الحسن محمد بن احمد زعفرانی، امام ابو الحسن محمد بن احمد بن الطیب کماروی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، امام حصص کی متعدد تصانیف یادگار ہیں، جن میں سے عرصہ ہوا کہ احکام القرآن جوابے موضوع پر ایک بے نظیر کتاب ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

احمد بن علی بن الحسن بصری (۶) ابوالحسن علی بن الحسن بن عبد النصار، (۷) ابویحییٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید رملی التوفی ۳۲۰ھ جو امام ممدوح کے وراق رہ چکے ہیں (۸) ابواسامہ محمد بن عبد الملک بن یزید الرواس (۹) ابوسالم محمد بن سعید الجلودی، (۱) ان میں حافظ ابن الاعرابی کے نسخہ میں کچھ حدیثیں کم ہیں اس میں کتاب الفتن والملاحم اور بعض اور ابواب بھی ساقط ہیں، ابن داسہ رملی اور لؤلؤتی کے نسخوں میں گو ترتیب کے اعتبار سے کچھ تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے لیکن تعداد احادیث کے لحاظ سے یہ نسخے قریب قریب ہیں، البتہ احادیث پر امام ابوداؤد نے جو کلام فرمایا ہے وہ بعض نسخوں میں زیادہ اور بعض میں کم ہے، ہاں ابویحییٰ لؤلؤتی کے نسخہ کو اس اعتبار سے ترجیح حاصل ہے کہ انھوں نے کتاب السنن کا سماع محرم ۲۵۷ھ میں کیا، جبکہ امام ابوداؤد نے اس کی آخری املاء کرائی تھی، کیونکہ اسی سال بروز جمعہ ۱۶ شوال کو امام ممدوح نے آخرت کا سفر اختیار کیا ہے۔ (۲)

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امام ابوداؤد بھستانی اپنے دور کے بعض تنگ نظر ارباب روایات کی طرح ائمہ اہل الرائے کے مخالف نہ تھے، بلکہ فقہاء کرام کی مساعی جلیلہ کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور بڑے ادب و احترام (بچھلے صفحہ کا بقیہ) طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے اور شرح مختصر الطحاوی کا عکسی فوٹو حضرت مولانا ابوالوفاء افغانی صدر مجلس احیاء المعارف العمائد کی خدمت میں میری نظر سے گزری ہے، امام ممدوح کی تمام تصنیفات آپ کے محدث اور حافظ حدیث ہونے پر شاہد عدل ہیں، مولانا شبید السلیل دہلوی نے تنویر العینین میں ان کو مجتہدین میں شمار کیا ہے، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حسن بن رشیق کے ترجمہ میں ان کا سنہ وفات ۳۷۰ھ تحریر کیا ہے۔

(۱) تہذیب الجہذیب، ترجمہ امام ابوداؤد۔

(۲) مقدمہ غایۃ المقصود شرح سنن ابی داؤد، واختصار علوم الحدیث از حافظ ابن کثیر ۱۳۔

سے ان کا ذکر خیر کرتے تھے، چنانچہ حافظ مغرب علامہ ابن عبدالبر قرطبی بسند متصل ان سے ناقل ہیں کہ:

حدثنا عبد الله بن محمد بن عبد المؤمن بن يحيى رحمه الله قال
أخبرنا أبو بكر محمد بن بكر بن عبد الرزاق التمار المعروف
بابن داسة قال سمعت أبا داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق
السجستاني رحمه الله يقول: رحم الله مالكا كان إماماً، رحم
الله الشافعي كان إماماً، رحم الله أبا حنيفة كان إماماً. (۱)
”اللہ تعالیٰ مالک پر رحمت نازل فرمائے، وہ امام تھے، اللہ تعالیٰ
شافعی پر رحمت نازل فرمائے وہ امام تھے، اللہ تعالیٰ ابوحنیفہ پر
رحمت نازل فرمائے وہ امام تھے۔“

جامع ترمذی

امام ترمذی کی کتاب، امام ابو داؤد جہتانی اور امام بخاری دونوں کے
طریقوں کی جامع ہے، ایک طرف انھوں نے اپنی کتاب میں احادیث احکام میں
سے صرف ان احادیث کو لیا ہے کہ جن پر فقہاء کا عمل رہا ہے، دوسری طرف اس کو
صرف احکام کے لئے مختص نہیں کیا، بلکہ امام بخاری کی طرح سب ابواب کی احادیث

(۱) الإبقاء في فضائل الثلاثة الأئمة الفقهاء ص ۳۲، اور جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۶۳، محدث کوثری نے
الانقضاء کے حواشی صفحہ ۹ میں یہ بھی تصریح کی ہے کہ امام ابو داؤد نے ان حضرات ائمہ ثلاثہ کے ذکر میں جو ترتیب ملحوظ
رکھی ہے، وہ ان کے طبقات کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اوطان کے اعتبار سے ہے، کیونکہ امام مالک مدنی ہیں، امام
شافعی مکی اور امام ابوحنیفہ کوفی۔

کو لے کر اپنی کتاب کو جامع بنا دیا ہے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ علوم حدیث کی مختلف انواع کو اپنی کتاب میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ علم حدیث کا بوقلموں زار بن گئی ہے، چنانچہ حافظ ابو جعفر بن الزبیر المتوفی ۷۸۰ھ صحاح ستہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

وللترمذی فی فنون الصناعة الحدیثیة مالم یشار کہہ غیرہ۔ (۱)

”امام ترمذی کو علم حدیث کے مختلف فنون کو جمع کرنے کے لحاظ

سے جواستیار حاصل ہے، اس میں کوئی اور ان کا شریک نہیں۔“

حافظ ابن رشید المتوفی ۷۲۲ھ نے ان فنون کی حسب ذیل تفصیل دی ہے،

(۱) تبویب (۲) بیان فقرہ (۳) علل احادیث و بیان صحیح وضعیف (۴) بیان اسماء و کنی

(۵) جرح و تعدیل (۶) جن سے احادیث نقل کی ہے ان کے متعلق یہ بتلانا کہ ان

میں سے کس نے آنحضرت ﷺ کو پایا ہے اور کس نے نہیں (۷) راویان حدیث کا

شمار، اس تفصیل کے بعد حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ ”یہ تو اس کتاب کے علوم کا اجمالی

بیان ہے اور تفصیل میں جایا جائے تو اور بھی متعدد علوم ہیں۔“ (۲)

حافظ ابوالفتح بن سید الناس فرماتے ہیں کہ مجملہ ان علوم کے جو ترمذی کی

کتاب میں موجود ہیں اور جن کو ابن رشید نے ذکر نہیں کیا ہے، یہ ہیں (۸) بیان

شدوذ (۹) بیان موقوف (۱۰) بیان مدرج۔ (۳)

اور حافظ ابوبکر بن العربی المتوفی ۵۴۳ھ عارضۃ الاحوذی شرح ترمذی

میں رقمطراز ہیں:

”اس کتاب میں حسب ذیل چودہ علوم ہیں، احادیث کی اس

طرح تدوین کہ جو عمل سے قریب تر کر دیتی ہے، بیان اسناد، تصحیح و تضعیف، تعداد طرق، جرح و تعدیل، بیان اسم و کنیت رواۃ، بیان وصل و انقطاع، معمول بہ اور متروک العمل روایات کی توضیح، احادیث کتاب کے رد و قبول کے بارے میں علماء کا جو اختلاف ہے اس کا بیان، حدیثوں کی توجیہ و تاویل کے سلسلہ میں علماء کے اختلاف آراء کا ذکر، اور یہ وہ علوم ہیں کہ ان میں سے ہر ایک علم اپنی جگہ مستقل حیثیت رکھتا ہے۔“ (۱)

محدث حاکم نیشاپوری اور خطیب بغدادی نے جامع ترمذی کو صحیح کہا ہے (۲) اور حافظ ابوبکر بن نقطہ بغدادی التونی ۶۲۹ھ اپنی مشہور کتاب التقیید فی رواۃ الکتاب و المسانید میں خود امام ترمذی کی زبانی ناقل ہیں کہ:

”صنفت هذا المسند الصحيح وعرضته على علماء الحجاز
فرضوا به وعرضته على علماء العراق فرضوا به وعرضته على
علماء خراسان فرضوا به ومن كان في بيته هذا الكتاب فكأنما
في بيته نبي ينطق وفي رواية يتكلم.“ (۳)

”میں نے اس المسند^{الصحيح} (یعنی کتاب الجامع) کو تصنیف کر کے

علماء حجاز کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو پسند کیا، اور علماء

(۱) عارضۃ الاخوان ص ۲۳ و ۲۵ طبع نظامی کاپور، یہ کتاب مجموعہ شروح اربعہ ترمذی کے ساتھ اس کے حاشیہ پر

طبع ہوئی ہے۔ (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۳۶ طبع حلب ۱۳۵۰ھ۔

(۳) الہدایۃ النہایۃ از حافظ ابن کثیر ص ۱۱ طبع مصر۔

عراق کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو پسند کیا، اور علماء
خراسان کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو پسند کیا، اور جس
کے گھر میں یہ کتاب موجود ہے، اس کے گھر میں گویا کہ پیغمبر
موجود ہے کہ جو خود بتا رہا ہے۔“

اور حافظ ابوالفتح بن سید الناس التوفی ۳۴۷ھ شرح ترمذی کے مقدمہ میں
حافظ یوسف بن احمد سے نقل کرتے ہیں:

لأبي عيسى فضائل تجمع وتروى وتسمع، وكتابه من
الكتب الخمسة التي اتفق أهل الحل والعقد والفضل والفقہ
من العلماء والفقهاء وأهل الحديث النبهاء على قبولها
والحكم بصحة أصولها (۱)

”امام ابو عیسیٰ (ترمذی) ایسے فضائل کے حامل ہیں کہ جن کو لکھا
جاتا ہے اور بیان کیا جاتا ہے اور سنا جاتا ہے اور ان کی کتاب ان
پانچ کتابوں میں داخل ہے کہ جن کی قبولیت اور ان کے اصول کی
صحت کے فیصلہ پر علماء، فقہاء اور اکابر محدثین میں سے اہل حل
وعقد اور ارباب فضل و دانش نے اتفاق کیا ہے۔“

اور حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں کہ ایک بار ہرات میں
امام ابو اسلم علیہ السلام بن محمد انصاری (۲) سے امام ترمذی اور ان کی جامع کا ذکر

(۱) اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ پیر جھنڈو ضلع حیدرآباد سندھ میں میری نظر سے گزرا ہے۔

(۲) شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری مشہور محدث اور صوفی ہیں، امام ترمذی سے ان (بقیہ اگلے صفحہ)

آیا تو فرمانے لگے کہ

کتابہ عندی أنفع من کتاب البخاری ومسلم لأن کتابی البخاری ومسلم لا یقف علی الفائدة منهما إلا المتبحر العالم و کتاب أبی عیسیٰ یصل إلی فائدته کل أحد من الناس (۱)
 ”ان کی کتاب میرے نزدیک بخاری و مسلم کی کتاب سے زیادہ نافع ہے، کیونکہ بخاری و مسلم کی کتابوں سے تو صرف عالم تبحر ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن ابوعیسیٰ کی کتاب سے ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے۔“

یہ واضح رہے کہ اگرچہ امام ترمذی امام بخاری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، تاہم یہ شرف ان کو بھی حاصل ہے کہ خود استاد نے ان سے حدیث کا سماع کیا ہے، چنانچہ ”أبواب التفسیر“ سورة الحشر میں حسب ذیل روایات کو لکھ کر
 ”حدثنا عبد الله بن عبد الرحمن عن هارون بن معاوية عن حفص بن غياث عن حبيب بن أبي عمرة عن سعيد بن جبیر عن النبي ﷺ
 مرسلاً“ فرماتے ہیں:

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) کو بہ دو واسطہ تلمذ حاصل ہے، سال ولادت ۳۹۶ھ اور سال وفات ۴۸۱ھ ہے، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا نہایت مبسوط ترجمہ لکھا ہے، جو ان لفظوں سے شروع ہوتا ہے شیخ الاسلام الحافظ الامام الزاحد یہ ترجمہ سات صفحات پر پھیلا ہوا ہے، انھوں نے امام ابو حنیفہ کی ایک منہ بھی لکھی ہے، جس کا نام ہے جمع حدیث ابی حنیفہ، اس سند کو حافظ سعانی ان سے بدو واسطہ روایت کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو الجوہر المفیہ ترجمہ نصر بن سيار)

(۱) شروط الائمة الستہ ص ۱۶۔

سمع مني محمد بن إسماعيل هذا الحديث.

”مجھ سے محمد بن اسماعیل نے یہ حدیث سنی ہے۔“

اسی طرح ”أبواب المناقب“ میں حدیث ”یا علی لا یحل لأحد أن یجنب فی هذا المسجد غیري وغیرک“ کے متعلق لکھا ہے کہ ”وقد سمع محمد بن اسمعيل مني هذا الحديث“ اور امام بخاری نے خود ان کے سامنے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ: ما انتفعت بك أكثر مما انتفعت بي (۱) ”میں نے تم سے اس سے زیادہ نفع اٹھایا، جتنا تم نے مجھ سے اٹھایا۔“

بعض مواقع پر امام ترمذی نے اپنی جامع میں احادیث کی تصحیح کے سلسلہ میں امام بخاری و مسلم سے اختلاف بھی کیا ہے، چنانچہ ”باب الإستنجاء بالحجرین“ میں حدیث عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ”قال حرج النسي عليه السلام لحاجته فقال التمس لي ثلاثة أحجار..... الخ“ کو نقل کر کے اور اس کے مختلف طرق بیان کر کے لکھتے ہیں کہ:

هذا حديث فيه اضطراب، قال أبو عيسى سألت عبد الله بن عبد الرحمن، أي الروايات في هذا عن أبي إسحاق أصح فلم يقض فيه بشئني، وسألت محمداً عن هذا فلم يقض فيه بشئني، كأنه رأى حديث أبي إسحاق عن عبد الرحمن بن الأسود عن أبيه عن عبد الله أشبه، ووضعه في كتابه الجامع، وأصح شئني في هذا عندي حديث إسرائيل وقيس عن أبي

إسحاق عن أبي عبيدة عن عبد الله لأن إسرائيل أثبت وأحفظ
لحديث أبي إسحاق من هؤلاء، وتابعه على ذلك قيس بن
الربيع، وسمعت محمد بن المثنى يقول: سمعت
عبد الرحمن بن مهدي يقول: ما فاتني الذي فاتني من حديث
سفيان الثوري عن أبي إسحاق إلا لما اتكلت به على
إسرائيل لأنه كان يأتي به أتم، قال أبو عيسى، وزهير في أبي
إسحاق ليس بذلك لأن سماعه منه بآخره، سمعت أحمد بن
الحسن يقول: سمعت أحمد بن حنبل يقول: إذا سمعت
الحديث من زائدة وزهير فلا تبال أن لا تسمعه من غيرهما
إلا حديث أبي إسحاق.

”اس حدیث میں اضطراب ہے، میں نے عبد اللہ بن
عبد الرحمن، (امام دارمی) سے پوچھا تھا کہ اس بارے میں
ابو اسحاق سے کوئی روایت زیادہ صحیح ہے؟ تو وہ کچھ فیصلہ نہ کر
سکے، اور محمد (امام بخاری) سے پوچھا تو انھوں نے بھی کوئی فیصلہ
نہیں کیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ”ابو اسحاق عن
عبد الرحمن بن الأسود عن أبيه عن عبد الله“ والے
طریق کو زیادہ مناسب سمجھا، اس لئے اپنی کتاب الجامع میں اسی
کو جگہ دی اور میرے نزدیک اس باب میں ”إسرائيل وقيس
عن أبي إسحاق عن أبي عبيدة عن عبد الله“ والی سند

زیادہ صحیح ہے کیونکہ اسرائیل ابواسحاق کی حدیث میں ان سب سے زیادہ بچے اور سب سے زیادہ حافظ ہیں اور اس روایت میں قیس بن الربیع نے ان کی متابعت بھی کی ہے، میں نے محمد بن المثنیٰ کو یہ بیان کرتے سنا کہ عبدالرحمن بن مہدی کہتے تھے کہ ابواسحاق سے سفیان ثوری کی روایت کردہ حدیثیں جو مجھ سے چھوٹیں وہ صرف اس سبب سے کہ میں نے ان روایات کے سلسلہ میں اسرائیل پر اعتماد کیا کیونکہ وہ ان کو مکمل طور پر بیان کیا کرتے تھے اور زہیر، ابواسحاق کی روایت میں کچھ اچھے نہیں ہیں کیونکہ ان کا سماع ابواسحاق سے ان کی اخیر عمر میں تھا (جبکہ بڑھاپے کے سبب ابواسحاق کے حواس میں انتشار ہو چکا تھا) میں نے احمد بن حسن کو بیان کرتے سنا کہ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ تم ابواسحاق کی حدیث کو چھوڑ کر پھر زائدہ اور زہیر سے جو حدیث بھی بن لو اس کو دوسرے سے سننے کی فکر نہ کرو۔“

اسی طرح ”باب ما یقال بعد الوضوء“ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کر کے کہ قال رسول اللہ ﷺ من توضأ فأحسن الوضوء ثم قال أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شریک له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله..... الخ اور اس کے طرق کی تفصیل بیان کر کے فرماتے ہیں:

هذا حديث في إسناده اضطراب، ولا يصح عن النبي ﷺ في هذا الباب كثير شني.

”اس حدیث کی اسناد میں اضطراب ہے اور آنحضرت ﷺ

سے اس باب میں کچھ زیادہ صحت کو نہیں پہنچا۔“

حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث صحیح مسلم میں مذکور ہے، اسی طرح تحقیق رجال میں بھی بعض مقامات پر امام بخاری کے مقابلہ میں امام دارقطنی کے قول کو ترجیح دی ہے۔ (۱)

حافظ ابو جعفر بن الزبیر نے اپنے برتاج میں تصریح کی ہے کہ اس کتاب کو امام ترمذی سے حسب ذیل چھ حضرات نے روایت کیا ہے (۱) ابو العباس محمد بن احمد بن محبوب (۲) حافظ ابو سعید یثیم بن کلیب شاشی التونی ۳۳۵ھ صاحب ہدایہ نے جامع ترمذی کو ان ہی کے طریق سے روایت کیا ہے۔ (۲) (۳) ابو ذر محمد بن ابراہیم (۴) ابو محمد حسن بن ابراہیم قطان (۵) ابو حامد احمد بن عبد اللہ تاجر (۶) ابو الحسن وا ذری۔ (۳) امام ترمذی نے اپنی جامع میں کتاب العلل کے اندر امام ابو حنیفہ سے حسب ذیل روایت نقل کی ہے۔

حدثنا محمود بن غیلان حدثنا أبو یحیٰ الحمانی قال سمعت

أبا حنیفۃ یقول ما رأیت أحداً أكذب من جابر الجعفی ولا

أفضل من عطاء بن أبی رباح. (۴)

”میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا اور عطاء بن ابی رباح سے

افضل کسی کو نہیں دیکھا۔“

(۱) ملاحظہ ہو ”باب ما ذکر فی الشرب ثقتین“۔ (۲) الجواہر المفیۃ۔

(۳) مقدمہ قوت المعتدی۔ (۴) جامع ترمذی ج ۲ ص ۳۳۳ طبع مصر ۱۲۹۲ھ۔

اس روایت کا تعلق رجال کی جرح و تعدیل سے ہے اور امام ترمذی نے اس کو سند کے طور پر نقل کیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ امام ممدوح کے نزدیک امام ابو حنیفہ کا شمار ان ائمہ میں ہے کہ جن کے قول سے جرح و تعدیل کے باب میں سند پکڑی جاتی ہے۔ (۱)

(۱) جرح و تعدیل کے باب میں امام ابو حنیفہ کے فیصلے اس قدر سچے تھے کہ محققین فن کو ہمیشہ ان کے آگے تسلیم خم کرنا پڑا، چنانچہ اسی جابر بھی کو لے لیجئے ایک طرف امام ابو حنیفہ کا اس کے بارے میں یہ فیصلہ ہے، دوسری طرف اس کی نسبت ائمہ جرح و تعدیل کی یہ رائیں ہیں، سفیان ثوری کا بیان ہے کہ ماریست اور عیسیٰ الحدیث منہ (میں نے ان سے زیادہ حدیث میں محتاط نہیں دیکھا) شعبہ کہتے ہیں کان جابر إذا قال حدثنا و سمعت فهو من أوفق الناس (جابر جب حدیث اور سمعت کہدے تو اس کا شمار اوثق الناس میں ہے) ایک دفعہ سفیان ثوری نے شعبہ سے صاف کہہ دیا کہ اگر تم نے جابر بھی کے بارے میں کچھ کہا تو میں تمہارے بارے میں کہنے لگوں گا) کعب کا قول ہے کہ تم لوگ اور چاہے کسی چیز میں شک کرو مگر اس بارے میں بالکل شک نہ کرو کہ جابر ثقہ ہے، اس سے ہم مسر، سفیان ثوری، شعبہ اور حسن بن صالح نے حدیثیں بیان کی ہیں (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ترجمہ جابر بھی) (۱) باب نظر غور کریں کہ جابر بھی کی توثیق کرنے والے کسی شان کے اکابر ہیں، تاہم تحقیق کے بعد اخیر فیصلہ جو ائمہ رجال نے صادر کیا وہ یہی ہے کہ جابر بھی کی روایت قابل اعتبار نہیں، اسی طرح زید بن عیاش کے بلایتے میں امام ابو حنیفہ اور امام مالک میں اختلاف رائے ہے، امام ابو حنیفہ اس کو مجہول بتاتے ہیں، لیکن امام مالک نے اپنی مؤطا میں اس کی سند سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی وہ روایت نقل کی ہے، جس میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور اور چھوڑ دیا کو باہم بیچنے سے منع فرمایا ہے (مؤطا "باب ما یکرہ من بیع النمر" بعد کو اگرچہ بعض محدثین نے امام مالک کی تقلید میں اس روایت کو صحیح قرار دیا لیکن خود امام بخاری و مسلم نے اس بارے میں امام ابو حنیفہ کے فیصلے سے موافقت کی ہے، چنانچہ محدث حاکم نیشاپوری، المسند علی ابن حسین میں لکھتے ہیں کہ

هذا حديث صحيح لا جماع أئمة أهل النقل على إمامة مالك بن أنس أنه محكم

في كل ما يرويه من الحديث إذا لم يوجد في رواياته إلا الصحيح خصوصاً في

حديث أهل المدينة والشيخان لم يخرجاه لما (بقية اگلے صفحہ پر)

صحیحین، سنن نسائی، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی یہ پانچ کتابیں وہ ہیں کہ جن کے بارے میں حافظ ابوطاہر سلفی المتوفی ۶۷۵ھ نے تصریح کی ہے کہ:

قد اتفق علی صحتها علماء الشرق والغرب.

”ان کی صحت پر مشرق و مغرب کے علماء کا اتفاق ہے۔“

حافظ ابن سید الناس، شرح ترمذی میں ابوطاہر کے اس قول کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

وهذا محمول منه علی مالہ یصرح بضعفه فیہا مخوجه او غیرہ.

”ان کی یہ تصریح ان روایات سے متعلق ہے کہ جن کے بارے

میں ان کے مخرج نے یا کسی اور نے ضعف کی صراحت نہ کی ہو۔“

سنن ابن ماجہ

یہ کتاب دو حیثیتوں کے اعتبار سے تمام صحاح ستہ میں ممتاز ہے، ایک حسن ترتیب یعنی جس خوبی اور عمدگی کے ساتھ احادیث کو باب وار، بغیر کسی تکرار کے اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے، دوسری کتابوں میں نہیں بیان کیا گیا، اور یہی اس کی وہ خوبی ہے کہ جس کو دیکھ کر ان کے شیخ حافظ ابو زرعہ رازی کی زبان سے

(مختلے صفحہ کا بقیہ) غشیاً من جہالة زید بن عیاش. (تہذیب المعجم، ترجمہ زید بن عیاش)

”یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ ائمہ اہل نقل کا امام مالک کی امامت پر اتفاق ہے کہ وہ جو

حدیث بھی نقل کر دیں اس میں کچے ہیں، اس لئے کہ ان کی روایات میں بالخصوص اہل

مدینہ سے جو حدیث وہ نقل کرتے ہیں اس میں سوائے صحیح روایت کے اور کوئی روایت

نہیں پائی گئی اور امام بخاری و مسلم نے اس روایت کی تخریج

زید بن عیاش کی جہالت کے خوف سے نہیں کی۔

بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ:

”اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی، تو فن حدیث کی

اکثر جوامع اور مصنفات بیکار اور معطل ہو کر رہ جائیں گی۔“

حافظ ابو زرعہ کی یہ پیشن گوئی حرف بحرف صادق ہوئی اور آج ہم دیکھ رہے

ہیں کہ حدیث کی بہت سی کتابیں جو صحت اسناد اور جودت روایات کے اعتبار سے

کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں، وہ قبول عام حاصل نہ کر سکیں جو سنن ابن ماجہ کو حاصل ہے،

جیسے صحیح ابن حبان، جس کے متعلق مورخ ابن العمد حنبلی نے تصریح کی ہے کہ:

وأكثر النقاد على أن صحيحه أصح من سنن ابن ماجه (۱)

”اکثر ناقدین فن اس رائے پر ہیں کہ ان کی صحیح، سنن ابن

ماجہ سے صحیح تر ہے۔“

لیکن اس اصحیت کے باوجود اس کتاب کو وہ فروغ نصیب نہ ہو سکا جو سنن

ابن ماجہ کو ہوا، خود صحاح ستہ میں سنن نسائی پر جو اس سے صحت میں کہیں فائق ہے، اتنا

کام نہیں ہوا اور اس کے اتنے شروح و حواشی نہیں لکھے گئے، جتنے سنن ابن ماجہ کے لکھے

گئے ہیں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بستان الحمد ثین میں حافظ ابو زرعہ کے مذکورہ بالا

بیان کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

وفى الواقع از حسن ترتيب و سرد احاديث بے تکرار و اختصار آنچه ایں کتاب

دارد هیچ یک از کتب ندارد۔ (۲)

(۱) شذرات الذہب فی اخبار من ذہب از ابن العمد، ترجمہ ابن حبان۔

(۲) بستان الحمد ثین، ص ۱۲ طبع گلزار محمدی لاہور۔

”اور فی الواقع ترتیب کی خوبی اور بغیر کسی تکرار کے احادیث کا

لے آنا اور اختصار جو یہ کتاب رکھتی ہے کوئی کتاب نہیں رکھتی۔“

اور حافظ ابن کثیر، الباعث الحثيث الى معرفة علوم الحديث

میں رقمطراز ہیں:

وهو كتاب مفيد قوي التويب في الفقه (۱)

”یہ مفید کتاب ہے اور مسائل فقہ کے لحاظ سے اس کی نہایت عمدہ تبویب ہے۔“

اور حافظ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں:

و كتابه في السنن جامع جيد. ”ان کی کتاب سنن (احکام) میں

نہایت عمدہ جامع ہے۔“

دوسری نمایاں خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ یہ بہت سی ان حدیثوں پر

مشتمل ہے کہ جن سے صحاح ستہ کی دوسری کتابیں یکسر خالی ہیں اور اس بنا پر اس کی

افادیت ان کتابوں سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت معاذ بن

جبل رضی اللہ عنہ کا یہ معمول تھا کہ وہ عام طور پر ایسی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے، جو اوروں کو

معلوم نہ ہوتی تھیں، چنانچہ سنن ابن ماجہ میں ابوسعید حمیری کی زبانی منقول ہے کہ:

كان معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ يتحدث بما لم يسمع أصحاب رسول الله

ﷺ ويسكت عما سمعوا (باب النهي عن الخلاء على قارعة الطريق)

”حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ وہ حدیثیں بیان کرتے جو دیگر

صحابہ رضی اللہ عنہم نے سنی نہ تھیں اور جو دوسروں نے بھی سنی ہوتیں تو ان

کے ذکر سے خاموش رہتے۔“ (۱)

علامہ ابوالحسن سندھی کی رائے میں امام ابن ماجہ کا یہ طرز عمل حضرت معاذؓ کی اتباع پر مبنی ہے، چنانچہ وہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

لتكثير الفائدة، وكان المصنف رحمه الله تعالى تبع معاذاً في ذلك حيث أخرج من المتن في كثير من الأبواب ما ليس في الكتب الخمسة المشهورة وإن كانت ضعيفة وفي الباب أحاديث صحيحة أخرجتها أصحاب تلك الكتب في كتبهم.

”حضرت معاذؓ کا یہ طرز عمل کثرت افادہ کے لئے تھا اور گویا

مصنف نے بھی اس سلسلہ میں ان ہی کا اتباع کیا ہے کہ بہت سے ابواب میں ان حدیثوں کو نقل کیا جو کتب خمسہ مشہورہ میں نہیں ہیں، اگرچہ وہ ضعیف بھی ہیں اور اسی مضمون کی اور صحیح حدیثیں بھی موجود ہیں، جن کو ان کتابوں کے مصنفین نے نقل کیا ہے۔“

سنن ابن ماجہ میں بہت سی زائد حدیثوں کا پایا جانا ہی اس کا وہ امتیاز خاص ہے کہ جس کو دیکھ کر بہت سے حفاظ وقت نے صحاح کی تعداد پانچ سے بڑھا کر چھ کر دی، چنانچہ آپ سابق میں پڑھ چکے ہیں کہ حافظ ابن السکن نے اسلام کی بنیادی

(۱) یہ اصل میں حضرت کی انتہائی احتیاط تھی، صحابہ کرامؓ کو اس امر کا بڑا خیال رہتا تھا کہ روایت حدیث میں بھول چوک نہ ہونے پائے کیونکہ غلط روایت کے بیان کرنے پر وہ آنحضرت ﷺ سے دوزخ کی وعید سن چکے تھے اور اسی لئے بہت سے صحابہ حتیٰ الوسع بلا ضرورت حدیث بیان کرنے سے بچا کرتے تھے، یہی حال حضرت معاذؓ کا تھا چنانچہ جو حدیثیں دوسرے صحابہ بھی جانتے تھے یہ ان کو بیان نہیں کرتے تھے۔

کتابیں چار بتائی تھیں، اسی طرح حافظ ابن مندہ نے بھی مخزجین صحاح میں امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، اور امام نسائی ہی کے ذکر پر اکتفا کی ہے، بعد کو حافظ ابوطاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی مذکورہ بالا چاروں کتابوں کے ساتھ شمار کر کے تصریح کی کہ ان پانچ کتابوں کی صحت پر علماء شرق و غرب کا اتفاق ہے، حتیٰ کہ شیخ ابن صلاح المتونی ۶۴۲ھ اور علامہ نووی المتونی ۶۷۶ھ تک نے معتمد علیہ کتابوں کے سلسلہ میں ان ہی پانچ کتابوں کے مصنفین کی وفیات ذکر کی ہیں (۱) اور امام ابن ماجہ کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے۔ (۲) لیکن متأخرین نے ان کی رائے سے موافقت نہیں کی، چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی، تدریب الراوی شرح تقریب النوای میں علامہ نووی پر استدراک کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لم يدخل المصنف سنن ابن ماجة في الأصول وقد اشتهر في

عصر المصنف وبعده جعل الأصول ستة بإدخاله فيها. (ص ۳۰)

”مصنف (علامہ نووی) نے سنن ابن ماجہ کو بنیادی کتابوں میں

داخل نہیں کیا، حالانکہ خود مصنف کے عہد میں اور ان کے بعد

(۱) ملاحظہ ہو مقدمہ ابن صلاح، ص ۳۸ طبع حلب، اور علامہ نووی کی تقریب والتیسیر کی ”النوع الستون“ نیز خاتمة الاشارات الی بیان اسماہ المسميات از علامہ موصوف طبع لاہور۔

(۲) سخاوی نے فتح الغیث میں شیخ ابن صلاح کی طرف سے ابن ماجہ کو نظر انداز کرنے کی یہ وجہ بیان کی ہے۔

هو كونه ساذجاً عما حرص عليه أصحاب الكتب الخمسة من المقاصد التي يتدبرها يتعمرن المحدث خصوصاً وفيه احاديث ضعيفة جداً بل منكورة (ص ۳۷۶)

”یہ ان مقاصد سے خالی ہے جن پر مصنفین کتب خمسہ نے بڑی توجہ دی ہے اور جن پر غور و تدبر سے محدث کو مشق ہوتی ہے خاص طور پر جبکہ اس میں نہایت ضعیف بلکہ منکر حدیثیں تک ہیں۔“

سنن ابن ماجہ کو داخل کر کے چھ کتابوں کا بنیادی قرار دیا جانا

شہرت پذیر ہو چکا ہے۔“

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے سنن ابن ماجہ کو کتب

خمسہ کے بالمقابل جگہ دی، وہ حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی التونی ۵۰ھ ہیں،

جنہوں نے شروط الأئمة الستة اور أطراف الكتب الستة دو مشہور کتابیں تصنیف

کی ہیں، پہلی کتاب عرصہ ہوا کہ مصر اور ہندوستان میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، اس کتاب

میں حافظ موصوف نے ائمہ خمسہ کے ساتھ امام ابن ماجہ کی شرط پر بھی بحث کی ہے اور دوسری

کتاب میں ان چھوں کتابوں کے اطراف (۱) احادیث کو جمع کیا ہے، بعد کو تمام مصنفین

اطراف و رجال نے ان کی رائے سے اتفاق کیا، چنانچہ حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ:

فتابعه أصحاب الأطراف والرجال (۲)

”پھر مصنفین اطراف و رجال نے ان ہی کی متابعت کی۔“

ارباب رجال میں سب سے پہلے حافظ عبد الغنی مقدسی التونی ۶۰ھ نے

الکمال فی أسماء الرجال میں ان چھ کتابوں کے رجال کو یکجا مدون کیا ہے۔

حافظ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں:

(۱) ”اطراف“ کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے شروع سرے کو بتایا جان کرے کہ جس سے بقیہ حدیث کی یاد دہانی

ہو جائے یا اس کی تمام اسانید کو بالاستیعاب بیان کر دیا جائے یا ان کتابوں کا پتہ دیدیا جائے کہ جن میں یہ حدیث

مردی ہے، چنانچہ اطراف الكتب الستہ میں صحاح ستہ کی احادیث کو اسی طرح بقیہ حوالہ کتب جمع کر دیا گیا ہے۔ اس

کتاب کو صحاح ستہ کا انٹیکس سمجھا جاتا ہے، حافظ ابن طاہر نے اسی طرح کا ایک انٹیکس امام ابو حنیفہ کی احادیث کا

بھی تیار کیا ہے، جس کا نام ”اطراف احادیث ابی حنیفہ“ ہے، خیال ہے کہ اس کتاب میں حافظ موصوف نے امام

ابو حنیفہ کی احادیث کی جملہ اسانید کو ذکر کیا ہوگا۔ (۲) تدریب الراوی ص ۳۰۔

سنن ابی عبد اللہ کتاب حسن لولما کدرہ

احادیث و اہیہ لیست بالكثیرۃ (۱)

”سنن ابو عبد اللہ (ابن ماجہ) اچھی کتاب ہے، کاش اس کو چند

وابی حدیثیں جو تعداد میں زیادہ نہیں، خراب نہ کرتیں۔“

یہ چند روایات کہ جنہوں نے سنن ابن ماجہ جیسی صاف کتاب کو گدلا اور مکدر بنا دیا، ان کی تعداد کیا ہے، اس کے بارے میں حافظ محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں کہ میں نے شہر رے میں ایک قدیم جزء کی پشت پر حافظ ابو حاتم المعروف بخاموش کے قلم سے یہ لکھا دیکھا ہے:

قال أبو زرعة الرازي طالعت كتاب أبي عبد الله ابن ماجة فلم أجد

فيه إلا قدراً يسيراً مما فيه شعبي و ذكر قريب بضعة عشر. (۲)

”ابو زرعة رازی کا بیان ہے کہ میں نے ابو عبد اللہ بن ماجہ کی

کتاب کا مطالعہ کیا تو اس میں بجز تھوڑی سی مقدار کے کہ جن میں

کچھ خرابی موجود ہے اور کوئی بات نہ دیکھی، چنانچہ انھوں نے کچھ

اوپر دس روایات ایسی ذکر کیں۔“

اور حافظ ذہبی، تذکرہ الحفاظ میں خود امام ابن ماجہ کی زبانی یہ نقل ہیں:

عرضت هذه السنن على أبي زرعة فنظر فيه وقال اظن أن وقع

هذا في أيدي الناس تعطلت هذه الجوامع أو أكثرها، ثم قال:

لعل لا يكون فيه تمام ثلاثين حديثاً مما في إسناده ضعف. (۳)

”میں نے اس سنن کو حافظ ابو زرہ کی خدمت میں لے جا کر پیش کیا تو فرمانے لگے کہ میرے خیال میں یہ کتاب اگر لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ گئی تو یہ جوامع یا ان میں سے اکثر تصنیفات بیکار ہو کر رہ جائیں گی، پھر فرمایا کہ شاید اس میں پوری تیس حدیثیں بھی ایسی نہ ہوں کہ جن کی اسناد میں ضعف ہو۔“

اور حافظ سیوطی، زہر الربی علی المجتبیٰ کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

وَأَمَّا مَا حَكَاهُ ابْنُ طَاهِرٍ عَنْ أَبِي زُرْعَةَ الرَّازِيِّ أَنَّهُ نَظَرَ فِيهِ فَقَالَ لَعَلَّهُ لَا يَكُونُ فِيهِ تَمَامُ ثَلَاثِينَ حَدِيثًا مِمَّا فِيهِ ضَعْفٌ فَهِيَ حِكَايَةٌ لَا تَصَحُّ لَانْقِطَاعِ سَنَدِهَا، وَإِنْ كَانَتْ مَحْفُوظَةً فَلَعَلَّهُ أَرَادَ مَا فِيهِ مِنَ الْأَحَادِيثِ السَّاقِطَةِ إِلَى الْغَايَةِ أَوْ كَانَ مَا رَأَى مِنَ الْكِتَابِ الْإِجْزَاءَ أَمَنَهُ فِيهِ هَذَا الْقَدْرُ، وَقَدْ حَكَمَ أَبُو زُرْعَةَ عَلَى أَحَادِيثَ كَثِيرَةٍ مِنْهُ بِكَوْنِهَا بَاطِلَةٌ أَوْ سَاقِطَةٌ أَوْ مَنْكُورَةٌ وَذَلِكَ مُحْكِي فِي كِتَابِ الْعِلَلِ لِابْنِ أَبِي حَاتِمٍ.

”ابن طاہر نے (۱) ابو زرہ رازی سے جو یہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ شاید اس میں پوری تیس حدیثیں بھی ایسی نہ نکلیں کہ جن میں ضعف ہو، سو یہ حکایت صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کی سند میں انقطاع ہے اور اگر یہ روایت محفوظ ہے تو شاید انھوں نے انتہائی ساقط روایات کو مراد لیا ہے یا

(۱) ابو زرہ کا یہ بیان جیسا کہ ابھی آپ کی نظر سے گزرا، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے اور ابن طاہر نے تو شروط الائمة میں ان سے کچھ اور درس کی تعداد نقل کی ہے۔

پھر دیکھا ہی کتاب کا ایک حصہ تھا کہ جس میں ان کو اسی قدر مل سکا، اور یہ واقعہ ہے کہ ابو زرہؓ نے اس کی بہت سی حدیثوں کے متعلق باطل یا ساقط یا منکر ہونے کا فیصلہ کیا ہے، جو ابن ابی حاتم کی کتاب العلل میں منقول ہے۔“

اور حافظ ذہبی، سیر النبلاء میں لکھتے ہیں کہ:

وقول أبي زرعة لعل لا يكون فيه تمام ثلاثين حديثاً مما في مسنده ضعف أو نحو ذلك إن صح كأنما عني بثلاثين حديثاً الأحاديث المطرحة الساقطة، وأما الأحاديث التي لا تقوم بها حجة فكثيرة لعلها نحو الألف. (۱)

”اور ابو زرہؓ کا یہ بیان کہ شاید اس میں پوری تیس حدیثیں بھی ایسی نہ ہوں کہ جن کی سند میں ضعف ہے اگر صحیح ہے تو ان کی مراد ان تیس حدیثوں سے نہایت گری ہوئی اور ساقط روایتیں ہیں، ورنہ جن روایتوں سے کہ حجت نہیں قائم ہوتی، وہ تو بہت ہیں شاید ایک ہزار کے قریب ہوں۔“

غالباً یہ تیس کے قریب قریب وہی روایتیں ہیں کہ جن کو حافظ ابن جوزی نے موضوعات میں داخل کیا ہے، یا دیگر محدثین نے ان میں سے بعض روایات کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے ان روایات پر فنی نقطہ نظر سے ہم اپنی عربی تصنیف

”ما تمس إليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجة“ میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں، رہی عام ضعیف روایات سو واقعی اس کتاب میں بکثرت ہیں اور اگرچہ حافظ ابوالحاج مزی نے اس بارے میں ایک عام حکم لگا دیا ہے کہ:

کل ما انفرد به ابن ماجة فهو ضعيف.

”ہر وہ روایت جو صرف سنن ابن ماجة میں ہو اور صحاح ستہ کی کسی

دوسری کتاب میں نہ ہو وہ ضعیف ہے۔“

لیکن یہ صحیح نہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب میں

لکھتے ہیں کہ:

وليس الأمر في ذلك على إطلاقه باستقرائي وفي الجملة ففيه أحاديث كثيرة منكورة.

”میرے تتبع کے مطابق علی الاطلاق ایسا نہیں ہے اگرچہ فی

الجملة اس میں بہت سی منکر حدیثیں ہیں۔“

حافظ ابن حجر کی رائے میں احادیث کی بہ نسبت رجال کے بارے میں ایسا

کہنا زیادہ مناسب ہے، فرماتے ہیں:

لكن حمله على الرجال أولى وأما حمله على أحاديث فلا

يصح، كما قدمت ذكره من وجود الأحاديث الصحيحة

والحسان مما انفرد به عن الخمسة.

”لیکن حافظ مزی کی تصریح کو رجال پر محمول کرنا اولیٰ اور

حدیثوں پر محمول کرنا صحیح نہیں جیسا کہ میں نے سابق میں بتایا
کہ جن روایات میں وہ ائمہ خمسہ سے منفرد ہیں ان میں صحیح
حدیثیں بھی ہیں اور حسن بھی۔“

لیکن ہمارے استقراء اور تتبع کے اعتبار سے احادیث ایک طرف، رجال
کے بارے میں بھی کلی طور پر یہ حکم لگا دینا صحیح نہیں ہے۔

ہماری مطبوعات

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ	سیرت رسول اکرم ﷺ
حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ	اذا هبت ريح الايمان ﴿عربی﴾
مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ	الہند فی العہد الاسلامی ﴿عربی﴾
مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ	اصلاح
مولانا سید محمد الحسنیؒ	قرآن آپ سے مخاطب ہے
محدث کبیر مولانا عبدالرشید نعمانیؒ	تاریخ تدوین حدیث
بلال عبدالحی حسنی ندوی	حدیث کی روشنی
مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی	مکتوبات مفکر اسلام ﴿حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ﴾
بلال عبدالحی حسنی ندوی	سوانح مفکر اسلام ﴿حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ﴾
مفتی راشد حسین ندوی	تجہیز و تکفین کتاب و سنت کی روشنی میں



سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات، رائے بریلی